انظر كيف نصرف الآيات لعلهم يفقهون ۶/۶۵

اے مخاطب!
غور کر کہ ہم اپنی آیتوں کو کس طرح پھیر پھیر کر
لاتے ہیں تاکہ لوگ تصریف آیات کیساتھ قرآن کریم میں تفقہ کیا کریں

ترجمۃ القرآن بتصریف آیات الفرقان

المعروف بہ

تفسیر القرآن بالقرآن

جلد اول مشتمل بر دیباچہ و تفسیر سورہ بقر

شائع کردہ
ادارہ بلاغ القرآن ۱۱۰- این سمن آباد لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فہرست عنوانات بیش لفظ تفسیر القرآن بالقرآن

عنوانات	صفحہ

* * * * *

* * * * *

گذارش

ترجمہ و تفسیر زیرِ نظر کا تعارف (پیش لفظ) انتہائی عام فہم الفاظ میں پیش کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ عربی قواعد کی مشکل اصطلاحوں کی بجائے آسان ترین اصطلاحیں استعمال کی گئی ہیں۔ تاکہ کم علم حضرات بھی قرآن کریم کی اپنی پیش کردہ قواعد کی روشنی میں قرآنی مفہوم کو بآسانی سمجھ سکیں۔

یہ قرآن کریم پر پڑے ہوئے، روایات کے دبیز پردوں کو چاک کرنے کی مخلصانہ کوشش ہے۔ لیکن بتقاضاء بشریّت سہو و نسیان کیلئے حضورِ خداوندی میں دست بدعا ہیں ؛ رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ج ۲/۲۸۶

یہ کوشش حرفِ آخر نہیں۔ بلکہ ہمیشہ کیلئے دعوتِ فکر و تدبّر ہے (۴۷/۲۴)

(ادارہ طلوع القرآن)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ترجمۃ القرآن بتصریف آیات الفرقان

معروف بہ

تفسیر القرآن بالقرآن

پیش لفظ

(زیر نظر ترجمہ و تفسیر کا تعارف)

قرآن حق ہے

• إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِيلًا ۝ 76/23 اے رسول! بیشک ہم نے قرآن کو آپ پر اس طرح ٹھیک نازل فرمایا ہے۔ جو نازل کرنے کا حق ہے۔

• وَيَرَى الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ الَّذِي أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ هُوَ الْحَقَّ وَيَهْدِي إِلَى صِرَاطِ الْعَزِيزِ الْحَمِيدِ ۝ 34/6 اور اے رسول! جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اسے وہ لوگ جنہیں علم دیا گیا ہے، دیکھتے ہیں کہ وہ حق ہے۔ اور وہ غالب تعریف کئے ہوئے (اللہ) کے راستے کی ہدایت کرتا ہے۔ نیز اسی چیز کی تائید شہادتِ خداوندی موجود ہے۔ فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ إِنَّهُ لَحَقٌّ 51/23 آسمانوں اور زمین کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ قرآن حق ہے۔

حق کی تعریف

سطور بالا میں آپ قرآن حکیم کی داخلی شہادت کی روشنی میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ آنحضور سلامٌ علیہ[1] پر قرآن نازل ہوا، جو سرتاپا **حق** ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے، حق کی تعریف کیا ہے؟ عربی زبان میں ہر اس چیز کو، جو اس

---

[1] سم مخفف ہے سلامٌ علیہ کا یعنی اُس پر سلام ہو۔ قرآن کریم نے انبیاء پر سلام کہنے کیلئے سَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِينَ 37/181، سَلٰمٌ عَلٰى نُوحٍ 37/79، سَلٰمٌ عَلٰى إِبْرَاهِيمَ 37/109، سَلٰمٌ عَلٰى مُوسٰى وَهٰرُونَ 37/120 اور سَلٰمٌ عَلٰى إِلْ يَاسِينَ 37/130 کے الفاظ عطا فرمائے ہیں۔ حضرت یحییٰ کے تذکرہ میں آپ پر سلام ان الفاظ میں کہا گیا ہے۔ وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ۝ 19/15 لہٰذا اس ترجمہ و تفسیر میں انبیاء سلامٌ علیہم کے اسماءِ مبارکہ پر سم لکھا گیا ہے۔

طرح بشکل مشہود موجود ہو کہ اُس کے وجود سے دوست دشمن اور موافق و مخالف کسی کو مجالِ انکار نہ ہو، اُسے حق کہا جاتا ہے۔ مثلاً جب شکاری کا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھے اور شکار مجروح حالت میں سامنے پڑا ہو تو عربوں کے ہاں کہتے ہیں رَمیٰ فَاحَقَّ الرَّمِیَّۃَ۔ نیز اونٹنی کا حمل جب اس طرح نمایاں ہو جائے کہ کوئی انکار نہ کر سکے تو کہتے ہیں عِنْدَ حَقَّ لِقَاحُھَا۔

اسی طرح چونکہ ارض و سماوات، اور ان میں موجود ہر چیز کا وجود ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ اس لئے یہ پوری کائنات حق ہے۔ چنانچہ ارشادِ باری ہے:۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۶۴/۴ ——— اسی طرح ہر وقوعہ کو اُس کی حقیقی جزئیات سمیت حق کہا جاتا ہے۔ اور وہ الفاظ جن سے اُس وقوعہ کا ٹھیک ٹھیک اور صحیح صحیح اظہار ہوتا ہو، وہ بھی حق کہلاتے ہیں۔ قرآن کریم چونکہ وقوعہ کائنات کی ٹھیک ٹھیک خبر دیتا ہے، چونکہ اس کے الفاظ اُس کی صحیح صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ اس لئے یہ بھی حق ہے۔ چنانچہ جس طرح خدا تعالیٰ نے کائنات کے متعلق ارشاد فرمایا ہے:۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ اسی طرح قرآن کریم کے متعلق بھی ارشاد ہوا ہے:۔ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۳/۳ = اے رسول! اللہ نے آپ پر ناقابلِ انکار حقائق سے معمور ایک مقدس کتاب نازل فرمائی ہے۔

تفاسیر کے ڈھیر

اسی حق کی تفسیر القرآن بآیات الفرقان کی خدمت کیلئے آج ہم میدانِ عمل میں اُتر رہے ہیں لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس سے پہلے کوئی تفسیر موجود نہیں، کہ اس کام کیلئے زرِ کثیر کا بوجھ بھی اُٹھایا جائے اور وقت بھی خرچ کیا جائے؟۔ اس سوال کا جواب جگر تھام کر سننا پڑیگا ——— گذارش ہے کہ اس سے پیشتر متقدمین و متاخرین کی تفسیروں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ اور ایک ایک تفسیر کئی کئی جلدوں پر مشتمل ہے۔ مثلاً:۔

تفسیر ابنِ جریر طبری　۳۰ جلدوں کی ہے۔　اور تفسیر امام غزالی　۲۰ جلدوں کی

اسی طرح:۔ تفسیر امام ابنِ جوزی　۴۰ جلدوں پر مشتمل ہے　اور تفسیر ابن النقیب　۵۰ جلدوں پر

تفسیر الاُفودی　۱۲۰ جلدوں کی ہے　اور تفسیر حدائق ذات بہجتہ　۵۰۰ جلدوں کی

تفسیر مدارک التنزیل کی ۷ جلدیں ہیں، اور معالم التنزیل اور تفسیر کبیر کی آٹھ آٹھ۔ روح المعانی کی نو جلدیں ہیں۔ اور تفسیر مرسی کی ۲۴۔ کتاب الجامع فی التفسیر کی ۳۰ جلدیں ہیں اور کتاب التحریر والتجبر کی ۵۰ سے بھی زائد۔

تفسیر کے طالب علم کی زندگی ختم ہو جائیگی تفسیریں ختم نہیں ہونگی۔

اس کے علاوہ بغوی، بیضاوی، کشاف، سخاوی، بلقیسی، بقاعی، فراہی، شوکانی، جبائی، ابن تیمیہ، ماوردی، ابنِ منذر، ابن حبان، ابنِ فورک اور ابن ابوطالب مکی وغیرہ جیسی سینکڑوں تفاسیر پانچ پانچ اور سات سات جلدوں پر مشتمل اُس عظیم ذخیرے کی صورت میں موجود ہیں کہ اِن سب کا مطالعہ کرنا، اور ان کے مندرجات کو محض سرسری نگاہ سے دیکھنا بھی انتہائی مشکل ہے ——— اگر کوئی شخص متقدمین و متاخرین کی تفاسیر سے استفادہ حاصل کرنے کا ارادہ کر بیٹھے، جن میں کئی کئی سو صفحات پر مشتمل پانچ سو جلدوں کی تفسیر بھی موجود ہے، تو اُس کی زندگی ختم ہو جائیگی تفسیریں ختم نہیں ہونگی۔ یہ تو ہیں ابھی متقدمین کی تفسیریں۔ متاخرین میں سے

شاہ عبدالقادر، شاہ اشرف علی، شاہ عبدالعزیز، شاہ محمود الحسن، ابوالکلام آزاد، ڈپٹی نذیر احمد، مولوی فیروز الدین، مولوی احمد علی لاہوری اور مولوی ثناء اللہ صاحب امرتسری کی تفاسیر کے علاوہ، تفسیر نعیمی، عزیزی، تفہیم القرآن اور جامع التفاسیر جیسی سینکڑوں تفسیروں کے الگ ڈھیر لگے پڑے ہیں۔

تفسیری اختلافات ان لاکھوں بلکہ کروڑوں صفحات پر پھیلی ہوئی ہزاروں تفسیروں کا انداز بیان واحد ہے۔ تفسیر ابن جریر کو چونکہ اُمّ التفاسیر مانا گیا ہے۔ اس لئے سب تفسیریں قریب قریب اسی تفسیر کا پرتو ہیں۔ اور چونکہ تفسیر ابن جریر کا ماخذ کتب روایات ہے۔ اور روایات کو چونکہ احادیث رسول مانا گیا ہے۔ اس لئے یہ ہزاروں کی تعداد کو پہنچنے والی تفسیریں، اگرچہ متفقہ طور پر یہ فیصلہ نہیں دے سکتیں کہ $\frac{1}{102}$ میں مذکور افراد ہاروت و ماروت شیطان تھے یا فرشتے۔ لیکن پھر بھی ان سب کو رسولی تفسیریں ہی مانا جاتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم کی شہادت سے، جو آگے آ رہی ہے، یہ ثابت ہوتا ہے کہ رسول مقبول سلام علیہ کا تفسیری انداز صرف اور صرف تفسیر القرآن بالقرآن تھا۔

برادرانِ اسلام! اس دعوے کی دلیل تو قرآنی آیات کریمات کی روشنی میں آگے چلکر اپنے مقام پر پیش کی جائیگی۔ پہلے آپ اُس اعتراض کا جواب ملاحظہ فرمائیں جو تفسیر القرآن بالقرآن کے عنوان پر بالفاظ ذیل پیدا ہو سکتا ہے کہ:۔

قرآن کریم کی تفسیر، اور خود قرآن کریم کے ساتھ؟

نیز کیا خود رسول مقبول بھی قرآنی تفسیر کیلئے، قرآن کریم ہی کے محتاج تھے؟ کیا آنحضور اپنی رائے کیساتھ تفسیر نہیں فرمایا کرتے تھے؟

برادرانِ عزیز! ان حالات میں، کہ جہاں قرآن کریم کو مجمل، غیر مفصّل اور کُتب روایات کا محتاج مانا جاتا ہو۔ یہ سوال ایک اچنبھے کی صورت میں اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ کیا قرآن اپنی تفسیر آپ کر سکتا ہے؟ —— اس سوال کے جواب کیلئے سطور ذیل پر باندازِ تعمق غور فرمائیں:۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ کسی کتاب کی تفسیر وہ شخص کر سکتا ہے جو علمی لحاظ سے، یا تو صاحب کتاب سے افضل حیثیّت کا حامل ہو۔ اور یا کم از کم اُسی علمی سطح پر فائز ہو، جو خود صاحب کتاب کی ہے لیکن قرآن کریم چونکہ کتاب ہے اللہ تعالیٰ کی اور کوئی فرد بشر علم کی رُو سے نہ اُس سے افضل ہو سکتا ہے نہ اُس کی علمی سطح کا۔ فلہذا اس چیز کا سوال تک پیدا نہیں ہوتا کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کا مُفسّر کوئی بشر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اعلان فرما دیا ہے کہ اپنی کتاب کے مفسّر بھی ہم خود ہیں:۔

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا ○ $\frac{25}{33}$

(مفہوم) صاحب قرآن! لوگ آپکے پاس قرآن کی مثل نہیں لائینگے۔ مگر ہم ہی ہیں جو آپ کے پاس حق (قرآن) اور اسکی احسن تفسیر لاتے ہیں فلہذا آگے بڑھنے سے پہلے اس مسئلہ کو ذہن میں محفوظ کر لیجیئے گا کہ قرآن، کتاب ہے اللہ تعالیٰ کی۔ نہ کوئی فرد بشر علم کے لحاظ سے اس سے افضل

ہے نہ برابر۔ اسلئے اُس کی کتاب کا مُفسّر کوئی بشر نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنی کتاب کا مُفسّر بھی خود آپ ہے۔ جیسے کہ اُس نے قرآن کریم پر تدبّر و تفکّر کرنیوالوں کیلئے بتکرار کثیر اعلان کر دیا ہے کہ اپنی آیتوں کی تفسیر و تفصیل بھی ہم خود ہی کرتے ہیں:۔

• كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ ١٠/٢٤ - اسی طرح تفکر کرنیوالوں کیلئے اپنی آیتوں کی تفصیل ہم خود کرتے ہیں۔

• قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ○ ٦/٩٨ - بیشک ہم نے تفقہ کرنیوالوں کیلئے اپنی آیتوں کی خود تفصیل کر دی ہے۔ اور ساتھ ہی قرآن کریم پر تدبّر کرنا فرض قرار دیکر عدم تفکّر کیلئے سخت تنبیہ فرمائی ہے:۔

• اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ٤٧/٢٤ - پس لوگ قرآن میں تدبّر کیوں نہیں کرتے۔ کیا اُن کے ذہنوں پر کسی طرف سے تالے پڑے ہوئے ہیں؟ (یعنی لوگوں کو چاہیئے کہ ذہنوں پر تقلید کے تالے نہ ڈالیں بلکہ قرآن میں تدبّر کیا کریں) نیز فرمایا۔

• كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○ ٣٨/٢٩ (مفہوم):۔

اے رسول! آپ کی طرف ایک مبارک کتاب نازل کی گئی ہے۔ جس کی ایک غرض نزول یہ ہے کہ لوگ اس کی آیتوں پر تدبّر کیا کریں۔ اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں ۔۔۔ **غور فرمائیگا!** آیات بالا سے بالصراحت ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کریم پر تدبّر و تفکّر نہ کرنا منشاءِ الٰہی کے خلاف ہے ۔۔۔ نیز تدبّر فی القرآن کو قیامت تک کیلئے جاری رکھا گیا ہے، جس پر اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ٤٧/٢٤ - ٤/٨٢ اور لِيَدَّبَّرُوْٓا ٣٨/٢٩ کے خداوندی الفاظ، قیامت تک کیلئے قرآن کریم میں بطور شاہد موجود رہینگے۔ لہٰذا ذہن کو کسی سابقہ دور کے تدبّر و تفکّر کے تالوں کیساتھ مُقفل کر لینا، قرآن کریم کی لامحدود وسعتوں کو محدود کرنیکے مصداق ہے۔

تفقہ فی القرآن کا قرآنی طریقہ

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم پر تدبّر و تفقّہ کا طریقہ کیا ہے؟ ۔۔۔ کیا آیاتِ قرآنیہ کی تفصیل و تفسیر کیلئے اُن غیر قرآن کتابوں کی طرف رجوع کیا جائیگا؛ جو ایک ایک آیت کے کئی کئی شان نزول اور کئی کئی تفسیریں پیش کرتی ہیں؟

اس سلسلے میں آپ ٢٥/٢٤ کا اعلانِ خداوندی اُوپر ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ قرآن کریم کی تفصیل و تفسیر خود خدا تعالیٰ نے کر دی ہے۔ لہٰذا تفسیر زیرِ نظر میں خدا تعالیٰ کی اپنی فرمائی ہوئی تفسیر کو چھوڑ کر، جو خود قرآن کریم میں موجود ہے، کسی غیر قرآن تفسیر کی طرف رُخ نہیں کیا گیا۔ اور اس سوال کا جواب کہ آیاتِ قرآنیہ کی تفصیل و تشریح کا طریقہ کیا ہے؟ ۔۔۔ یہ بھی قرآن کریم کی اپنی ہی زبان میں ملاحظہ فرمائیں کہ اس کتابِ مقدّس کے نازل کرنیوالے نے اہلِ عالم کیلئے اپنی کتاب کا طریقۂ تفقہ اور تدبّر بھی خود واضح کر رکھا ہے:۔

ﻟ۔ • اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ○ ٦/٦٥

(مفہوم) صاحبِ قرآن! غور فرمائیگا، ہم کس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں: تاکہ لوگ ان میں تفقّہ کریں ۔۔۔ نیز فرمایا۔

ب۔ • اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ○ ٦/٤٦

(مفہوم) صاحبِ قرآن غور فرمائیگا، ہم کس طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں۔ پھر، لوگ ہیں کہ (تصریفِ آیات سے) اعراض کرتے ہیں

آیات بالا کی شق (د) میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ:-

رسول اکرم کا طرزِ تدریس اور طریقۂ تفقہ فی القرآن بھی تصریفِ آیات ہی تھا

• قرآنِ کریم کا اسلوبِ بیان یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی پاکیزہ کتاب کی آیتوں کو اس طرح پھیر پھیر کر بیان کیا ہے کہ اُس سے تفقّہ کے دروازے کھلتے اور تدبّر فی القرآن کی شمعیں روشن ہوتی ہیں۔ اور تصریفِ آیات کا اسلوب اختیار کرنے کا مقصدِ عظیم یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ تدبّر فی القرآن کے لئے تصریفِ آیات ہی کا انداز اختیار کریں۔ یعنی ہر آیت کے مفہوم و معانی کی تصدیق دوسری آیاتِ کریمات ہی کیساتھ کیا کریں (۶/۶۵) نیز شق (ب) میں آپ نے دیکھ لیا ہے کہ:-

• تفقہ فی القرآن کیلئے تصریفِ آیات کے قرآنی اسلوب کو چھوڑ کر کوئی اور طریقۂ تفقّہ اختیار کرنے کو قرآنِ کریم سے فرار قرار دیا گیا ہے (۶/۴۶) ـــــ پس تصریحاتِ بالا سے بصورتِ حق الیقین ثابت ہوا کہ خود قرآنی ہدایات کے مطابق قرآنِ کریم کی تفسیر و تبیین کا واحد طریقہ تصریفِ آیات ہے۔ اب اِس سلسلے کا آخری اور اہم ترین سوال یہ ہے کہ خود حاملِ قرآن، رسولِ عربی سلام علیہ کا طرزِ تدریس اور طریقۂ تفقہ فی القرآن کیا تھا؟ ـــ کیا آپ بھی تصریفِ آیات ہی کیساتھ درسِ قرآن دیا کرتے تھے، یا آپ کا طریقۂ تفقّہ تفسیر بالرائے کا حامل تھا؟ ـــــ اس سوال کا جواب خدا تعالیٰ نے خود آنحضور کی طرف ایک مخصوص خطاب فرماتے ہوئے باندازِ ذیل دے رکھا ہے:-

• وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ○ ۶/۱۰۵

(مفہوم) اور اے رسول! ہم اِسی طرح اپنی آیتوں کو پھیر پھیر کر لاتے ہیں (تاکہ آپ تصریفِ آیات کیساتھ درس دیا کریں) اور تاکہ لوگ کہہ اٹھیں کہ آپ نے خوب سمجھا دیا ہے۔ اور (تصریفِ آیات کی دوسری غرض یہ ہے) تاکہ ہم عقلمندوں کیلئے اپنی آیتوں کی خود تبیین کر دیں۔ فلہٰذا بدرجۂ اتم ثابت ہوا کہ رسولِ اکرم اِس قرآنی حکم کے مطابق تصریفِ آیات ہی کے ساتھ درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ یعنی آپ کا طریقۂ تفقّہ بھی تصریفِ آیات ہی تھا۔

آنحضور کا فریضۂ تبیینِ قرآن

قرآن کہتا ہے کہ تبیینِ قرآن آنحضور سلام علیہ پر فرض کی گئی تھی۔ چنانچہ سورۂ نحل میں خود آنحضور کو مخاطب کر کے ارشاد ہوا ہے:- • وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ ۱۶/۴۴ ـ اور اے رسول! ہم نے آپ کی طرف اپنا نصیحت نامہ اسلئے نازل فرمایا ہے کہ جو ضابطۂ حیات، نوعِ انسانی کی طرف نازل کیا گیا ہے۔ آپ اُسے لوگوں پر نہایت وضاحت و صراحت کیساتھ بیان کر دیں ـــــ اِس آیۂ جلیلہ سے بعض لوگ قرآن سے الگ رسولی تفسیر کا وجود ثابت کرتے اور کتبِ روایات کو رسولی تفسیر ٹھہراتے ہیں۔ حالانکہ اگر اِس نظریئے کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو آنحضور آیتِ مجیدہ ۱۶/۴۴ کے عامل ثابت نہیں ہوتے۔ کیونکہ کتبِ روایات میں قرآنِ کریم کی بائے بسم اللہ سے سین والناس کی تفسیر ہے ہی نہیں۔ جیسے کہ بخاری شریف کے، اگرچہ قرآن کے تیس۳۰ پاروں کے مقابلے پر پورے تیس۳۰ پارے ہیں لیکن کوئی پارہ کسی پارے کی تفسیر و تبیین پر مشتمل نہیں۔ حالانکہ مذکورہ نظریہ کے مطابق چاہیئے یہ تھا کہ بالترتیب ہر پارہ، ہر پارہ کی تفسیر و تبیین ہوتا ـــــ واضح رہے کہ ۱۶/۴۴ کے مطابق تبیینِ قرآن چونکہ آپ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ اِسلئے آپ کے مناصبِ جلیلہ میں سے ایک منصب یہ بھی ہے

کہ آپ قرآن کریم کو صرف پڑھکر ہی نہ سنائیں بلکہ اُسکی تشریح و تبیین بھی فرمایا کریں۔ حضور کے اِس منصب عظیمہ کی وضاحت 6/105 کی روشنی میں اُوپر گزر چکی ہے کہ آپ تصریفِ آیات کیساتھ درس قرآن دیا کرتے تھے، یعنی آیاتِ قرآنیہ کی تفسیر و تشریح آیاتِ قرآنیہ ہی کیساتھ کرکے 16/44 اور 6/105 ہر دو آیات کریمات کے احکام سے سبکدوش ہوجاتے۔ اور چونکہ آپ کی فرمائی ہوئی تفسیر، تصریفِ آیات کی صورت میں قیامت تک کیلئے خود قرآن کریم میں محفوظ ہے۔ اِسلئے آپ نے اُمت کو رسولی تفسیر کے نام سے کوئی الگ کتاب بھی نہیں دی تھی اور فریضۂ تبیین سے عہدہ برا بھی ہوچکے تھے۔

اِس کے برعکس جن کتابوں کو رسولی تفسیر بتایا جاتا ہے۔ اُن کی حالت یہ ہے کہ کسی آیت مجیدہ میں جو امر تفسیر طلب ہوتا ہے۔ اُس کی طرف رُخ تک نہیں کیا جاتا۔ جیسے کہ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ 2/31 میں تفسیر طلب یہ امر ہے کہ حضرت آدم کو کونسے نام سکھائے گئے تھے! لیکن بخاری شریف میں اِسکی تفسیر یہ لکھی ہے کہ :۔ قیامت کو لوگ حضرت آدم کے پاس شفاعت کیلئے جائینگے۔ لیکن وہ کہینگے مجھے اپنا گناہ یاد آرہا ہے، تم نوحؑ کے پاس جاؤ۔ (ملخص بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد دوم کتاب التفسیر صفحہ ۱۰)۔ اب بتایئے کیا اِس نام نہاد رسولی تفسیر نے بتایا ہے کہ وہ اسماء کیا تھے، جو آدم کو سکھائے گئے تھے؟

حالانکہ آیت بالا 16/44 میں قرآن کی تبیین آنحضورؐ کا فریضہ قرار دیا گیا ہے۔ اور 6/105 میں قرآنی اسلوب تصریفِ آیات کی غرض یہ بتائی گئی ہے کہ آپ متنازعہ مسائل اور متنازعہ الفاظ کی تشریح، تصریفِ آیات کیساتھ فرمایا کریں۔ لیکن نام نہاد رسولی تفسیر آنحضور کو اِس فرض سے غافل قرار دیتی ہے۔ اور نتیجہ یہ ہے کہ کتب روایات کو رسولی تفسیر ٹھہرانے والا ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے اپنے ہی اسمائے گرامی ہیں۔ جو حضرت آدم کو سکھائے گئے تھے۔ اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ انہیں بارہ اماموں کے نام سکھلائے گئے تھے حالانکہ تصریفِ آیات کی رُو سے حقیقت دونوں کے برخلاف ہے۔ (وضاحت اپنے مقام پر آگے آئیگی)۔ یاد رہے کہ خود آنحضورؐ سمیت قیامت تک کے لوگوں کیلئے آیاتِ قرآنیہ کے طریقۂ تبیین کی وضاحت 6/65 میں اور آنحضور کے طرزِ تدریس کی صراحت 6/105 میں موجود ہے جہاں ہر مفکرِ قرآن کیلئے تفسیر بالرائے کا دروازہ ہمیشہ کیلئے بند کر دیا گیا ہے۔ فلہذا تفسیر القرآن میں انسانی رائے کو ہرگز ہرگز دخل نہیں قرآن کی تفسیر تصریفِ آیات کی مدد سے خود قرآن کریم کیساتھ کرنا ہی منشاءِ الٰہی ہے۔ جیسے کہ اسی سورہ نحل کی آیت مجیدہ 16/44 وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ سے آگے 16/89 میں خدائے عزوجل نے آنحضرت کو مخاطب کرکے اسی امر کی تصدیق فرمائی ہے کہ آپ پر جو کتاب نازل فرمائی گئی ہے۔ وہ ہر مسئلے کی وضاحت خود کرتی ہے۔ کسی انسانی تفسیر کی محتاج ہرگز نہیں :۔

● وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتٰبَ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ 16/89

(مفہوم) اور اے رسول! ہم نے آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے، جو خود ہی ہر مسئلہ کی تشریح و تبیین کرنیوالی ہے۔

قرآن کریم کیساتھ کوئی غیراللہ کتاب ہرگز ہرگز واجب الاتباع نہیں

دیکھا آپ نے! کہ باری تعالیٰ نے آیت بالا میں اپنی کتاب کی اکملیت اور اسکے اپنی تفسیر آپ ہونے کی تصدیق کس وضاحت کیساتھ کردی ہے، فلہذا بالصراحت ثابت ہُوا کہ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی، تصریفِ آیات

کے خداوندی حکم ٦/٢٥ اور ٦/١٠٥ کے مطابق، اپنے درسوں میں اِس کتاب کی تفسیر، خود اسی کے ساتھ ہی فرمایا کرتے تھے، جو خود تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ ہے۔ اور چونکہ یہ کتاب خود مکمل، مفصّل اور مفسّر ہے۔ اور کسی بھی انداز سے کسی غیر اللہ کتاب کی محتاج نہیں اسی لئے خدائے علیم وخبیر نے پوری اُمّتِ مسلمہ کیلئے قرآنِ حکیم کے سوا کسی اور کتاب کو واجب الاتّباع ٹھہرایا ہی نہیں۔ بلکہ غیر اللہ کتابوں کے خیر خواہوں کی اتّباع سے مطلقاً روک دیا ہے:۔

● اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ ٣/٧

(مفہوم) ایمان والو! تمہارے رب کی طرف سے جو (کتاب) نازل کی گئی ہے اُس کی اتباع کرو۔ اور اُسکے سوا غیر اللہ کتابوں کے خیر خواہوں کی اتّباع ہرگز نہ کرنا ←دیکھیئے گا! اِس آئتِ مجیدہ پر غور کرنے سے یہ چیز نکھر کر عیاں ہو رہی ہے۔ کہ جب قرآنِ کریم کے سوا کوئی اور کتاب واجب الاتّباع ہے ہی نہیں تو ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم نوعِ انسانی کی جملہ ضروریات کیلئے کافی ہے۔ اگر یہ تفسیری ضروریات کی رُو سے ناکافی ہوتا تو "وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِیَآءَ" کے بعد استثنٰی کے طور پر "اِلَّا اَوْلِیَآءَ کُتُبِ التَّفَاسِیْرِ" یا "اِلَّا اَوْلِیَآءَ کُتُبِ الرِّوَایَاتِ" آنا چاہیئے تھا۔ لیکن جیسے کہ متعدد آیاتِ کریمات میں اعلان کیا جا چکا ہے کہ یہ کتاب، اپنی تفسیری اور تشریحی ضروریات تک کے لحاظ سے بھی کسی غیر اللہ کتاب کی محتاج نہیں، تو ثابت ہوا کہ ٢٥/٣٣ کے خداوندی اعلان کی رُو سے، کہ قرآن اور اسکی احسن تفسیر ہم خود لاتے ہیں، قرآنی تفسیر کیلئے تفسیر القرآن بالقرآن کا انداز ہی منشاءِ الٰہی کے عین مطابق ہے۔ اور ٦/١٠٥ کی خداوندی خبر کی روشنی میں، کہ آنحضور تصریفِ آیات ہی کیساتھ درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ تصریفِ آیات کا انداز ہی عینِ رسولی ہے۔ بالفاظِ دیگر آنحضور سلامٌ علیہ کی قرآنی تفسیر خود قرآنِ کریم کے اندر موجود ہے۔ یعنی ہر متنازعہ آئتِ مجیدہ کا مفہوم قرآنِ کریم کی دوسری آیاتِ کریمات کو بطور شاہد لا کر اخذ کرنا ہی سُنّتِ رسُول ہے۔ یعنی کسی بھی آئت کی تفہیم و تشریح کیلئے غیر اللہ کتابوں کا رُخ کرنا نہ منشاءِ الٰہی ہے نہ سُنّتِ رسُول۔

قرآن فہمی کے قرآنی اصول و قواعد کی اتباع لازم ہے

گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے کہ سابقہ تراجم و تفاسیر ایک دوسری سے بھی مختلف ہیں۔ اور خود اپنے اپنے دامن میں بھی باہمی اختلافات کے ذخائر سمیٹے ہوئے ہیں جس سے حق و صداقت کے متلاشی افراد سر پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ایک طرف تو یہ کہا جاتا ہے کہ:۔

● روایات کی مدد سے کی گئی یہ موجودہ تفسیریں ثنائی، موضح القرآن، عزیزی اور نعیمی وغیرہ سب رسولی تفسیریں ہیں۔ اور دوسری طرف اِن رسولی تفسیروں میں اسقدر تضاد و تخالف ہے کہ تفسیر ثنائی ہاروت ماروت کو شیطان کہتی ہے لیکن موضح القرآن انہیں فرشتے بتاتی ہے ٢/١٠٢ ولی اللّٰہی تفسیر جس ضمیر کا مرجع سورج ٹھہراتی ہے، تفسیر ثنائی اُسے گھوڑوں کی طرف لے جاتی ہے "حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ٣٨/٣٢" ——اور تفسیر ثنائی، جن الفاظ سے خدا تعالٰی کی محبت مراد لیتی ہے، موضح القرآن انہی سے اللہ کے ذکر سے غفلت قرار دیتی ہے "اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ ٣٨/٣٢" ——حتّٰی کہ اِن تفاسیر و تراجم میں حروف کے معانی تک باہمی اختلاف موجود ہے "وَمَآ اُنْزِلَ عَلَی الْمَلَکَیْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ٢/١٠٢" کے مَا کو تفسیر ثنائی نافیہ ٹھہرا کر

یہ تاثر دیتی ہے کہ بابل شہر کے ہاروت ماروت دو شیطان تھے۔ ان پر کچھ نازل نہیں ہوا تھا۔ اور اشرفی نعیمی، عزیزی وغیرہ تفسیروں نے اس مَا کو موصولہ گردان کر یہ مشہور کر رکھا ہے کہ ہاروت ماروت دو فرشتے تھے اور ان پر خدا تعالیٰ کی طرف سے جادو نازل ہوا تھا۔ العیاذ باللہ!

● یہ تو ہوا ان مختلف تراجم و تفاسیر کا ایک دوسری کیساتھ شدید تضاد و تخالف کا عالم جن میں سے ہر ایک کو صرف اس لئے رسولی تفسیر کہا جاتا ہے کہ سب کتب روایات کی مرہون منت ہیں۔ لیکن جب ان میں سے ایک ایک پر الگ الگ غور کیا جائے، تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب شکلی اختلافات سے بھی معمور ہیں۔ کہیں لکھتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ گمراہوں کو سخت سزا دینے والا ہے، وَاللّٰهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ○ ۳/۲۔ اور کہیں یہ تاثر دیتی ہے کہ خود اللہ ہی گمراہ کرتا ہے۔ اور جسے وہ گمراہ کردے، اُسے کوئی راہ دکھلانے والا نہیں۔ وَمَنْ يُضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ○ ۳۹/۳۶ تو اس طرح ان تفاسیر و تراجم سے یہ تصور جنم لیتا ہے کہ معاذ اللہ، استغفر اللہ، خدا تعالیٰ خود ہی گمراہ کرتا ہے۔ اور خود ہی شدید سزا کی وعید سناتا ہے۔

● اسی طرح سابقہ تراجم میں کہیں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ ہر شخص کا حصہ وہی ہے جتنی کہ وہ خود کوشش کرتا ہے۔ وَأَنْ لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ○ ۵۳/۳۹ اور کہیں یہ کہ اللہ تعالیٰ جس کا چاہتا ہے رزق فراخ کر دیتا ہے۔ اور جس کا چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَشَاءُ وَيَقْدِرُ ○ ۴۲/۱۲

● ایک طرف یہ تفاسیر و تراجم یہ نظریہ پیش کرتے ہیں کہ اللہ پورے عالمین کی ربوبیت کرنیوالا ہے، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ○ ۱/۱، اور ہر ذی جان کا رزق اللہ کے ذمہ ہے، وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ۱۱/۶۔ اور دوسری طرف مشاہداتِ عالم میں اس مفہوم کی عملاً تکذیب پائی جاتی ہے۔ کیونکہ ایک ایک قحط میں لاکھوں انسان اور کروڑوں مویشی علماء کرام کی نگاہوں کے سامنے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مرتے پائے جاتے ہیں

حقیقت حال تو اس طرح جو شخص قرآن حکیم کی ان تفاسیر و تراجم سے استفادہ کی کوشش کرتا ہے۔ اُلٹا بحرِ استعجاب میں غرق ہو کر رہ جاتا ہے۔ کہ کیا یہ مختلف و متضاد مفاہیم اُسی مقدس کتاب کے ہیں جس کی داخلی شہادت یہ ہے کہ اس میں تضاد و تخالف کا گزر تک نہیں۔ گزر تک کیوں نہیں؟ — اسلئے کہ یہ خدا تعالیٰ کیطرف سے نازل کردہ ہے:

● وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ○ ۴/۸۲، اگر یہ قرآن غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اس میں کثیر اختلاف موجود پاتے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآنی دعووں کی پامالی کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب کو سمجھنے کے جو اصول خود بیان فرمائے ہیں۔ اُن سے مطلقاً اعراض کرتے ہوئے، قرآنِ حکیم کی تفسیر اُن کتابوں کو ٹھہرا لیا گیا ہے جن کے متعلق مشہور تو یہ ہے کہ یہ قرآن کریم کی رسولی اور پیغمبرانہ تفسیر ہیں لیکن ان کتابوں کا اپنا اعلان یہ ہے کہ ان کے مندرجات، عن فلاں عن فلاں کی روایت سے آنحضور کیطرف منسوب ہیں۔

کیا حضرت عمرؓ قرآن کی تفسیر رسولِ مقبولؐ سے بہتر جانتے تھے؟

افسوس ہے کہ ذخیرۂ روایات کو، اگر قرآن کی رسولی تفسیر مانا جائے، تو صاحبِ قرآن سلام علیہ کو قرآن فہمی کے اُن اصول و قواعد سے معاذ اللہ معاذ اللہ بے خبر ماننا پڑتا ہے، جو خود خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر محفوظ کر رکھے ہیں۔ یہ اصول و قواعد تو بالترتیب عنقریب پیش کئے جائیں گے۔ پہلے آپ آنحضورؐ کی طرف منسوب کردہ تفسیر کا نمونہ ملاحظہ فرمائیں۔ جو بخاری شریف کے الفاظ میں یہ تاثر دیتا ہے کہ آنحضور سلام علیہ کے مقابلے پر حضرت عمرؓ قرآن کی بہتر تفسیر جانتے تھے۔ اور خدا تعالیٰ آنحضور کی تفسیر کی بجائے حضرت عمرؓ کی تفسیر کی تائید فرماتا تھا۔ چنانچہ آیت ذیل پر پہلے خود غور کریں۔ اور پھر بخاری شریف میں درج اسکی رسولی اور فاروقی تفاسیر کا تقابل ملاحظہ فرمائیں:۔

● اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ۹/۸۰

(مفہوم) اے رسولؐ! ان (منافقین) کیلئے آپ مغفرت طلب کریں یا نہ کریں (ہمارے لئے برابر ہے) اگر آپ اُن کیلئے ستر بار بھی مغفرت طلب کریں گے۔ تو پھر بھی اللہ تعالیٰ انہیں معاف نہیں کریگا ـــــ آیت مجیدہ کے الفاظ سے ایک معمولی عقل کا آدمی بھی سمجھ سکتا ہے کہ آنحضور سلام علیہ کو منافقین کیلئے طلب مغفرت سے منع کر دیا گیا ہے۔ کیونکہ جس عمل کا کرنا اور نہ کرنا برابر ہو، اللہ کے رسولؐ سے اُس عملِ بیکار کا ارتکاب ہرگز ممکن نہیں خصوصًا ایسی صورت میں جبکہ آپ پر واضح کر دیا گیا ہو کہ اس کا کرنا اور نہ کرنا مساوی ہے۔ لیکن بخاری شریف کی ایک روایت یہ تاثر دیتی ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے ذہن میں اس آیت کی یہ تفسیر محفوظ فرما رکھی تھی، کہ آپ کو اختیار دے دیا گیا ہے کہ چاہیں تو منافقوں کیلئے طلب مغفرت فرمائیں۔ اور چاہیں تو نہ فرمائیں ـــــ لیکن حضرت عمرؓ نے اس آیت سے یہ مفہوم اخذ فرمایا کہ آنحضور کو منافقین کیلئے طلب مغفرت سے منع [illegible]۔ مگر اب دیکھنا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کس کی تفسیر کو صحیح قرار دیا۔ اور کس کی تفسیر کو غلط ٹھہرایا اس کیلئے بخاری شریف کے باب [illegible] میں درج، ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں روایات کے بتائے ہوئے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی دعائے مغفرت (نمازِ جنازہ) کا واقعہ ملاحظہ فرمائیں۔ طوالت کے خوف سے روایت کے متن کی بجائے، علمائے روایات کا خود نوشت ترجمہ پیش خدمت ہے:۔

"مسدد، یحییٰ بن سعید، عبید اللہ، نافع ابن عمرؓ سے روایت کرتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی (منافق) جب مر تو اُس کا بیٹا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اور عرض کیا یا رسول اللہ ہمیں اپنا کرتہ عنایت کیجئے۔ کہ ہم اس میں اُس کا کفن بنائیں، اور آپ اُس پر (جنازہ کی) نماز پڑھیں۔ اور اُس کیلئے دُعائے مغفرت کریں۔ نبی صلعم نے اُس کو اپنا کرتہ عنایت کیا۔ اور فرمایا کہ مجھے خبر دینا تو میں نماز پڑھا دونگا۔ جب آپ نے اُس پر نماز پڑھنے کا ارادہ کیا۔ تو عمرؓ نے آپ کو کھینچا اور کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منافقین پر نماز پڑھنے سے منع کیا ہے (۹/۸۰) آپ نے فرمایا مجھے دونوں باتوں کا اختیار دیا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ، تم ان کیلئے دعائے مغفرت کرو یا نہ کرو۔ اگر تم ان کیلئے ستر بار بھی دُعائے مغفرت کرو گے تو بھی اللہ تعالیٰ انہیں نہیں بخشیگا۔ چنانچہ آپ نے اُس پر نماز پڑھی تو یہ آیت اُتری (وَلَا تُصَلِّ عَلٰۤی اَحَدٍ مِّنْهُمْ

مَاتَ اَبَدًا ۹/۸۴) اور اُن میں سے کسی پر کبھی بھی نماز نہ پڑھنا جب کہ مر جائیں۔ (مترجم بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد اوّل صفحہ ۴۸۵)

دیکھا آپ نے! یہ ہے بخاری شریف کی پیش کردہ رسولی تفسیر کا نمونہ، کہ آیت مجیدہ "اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْلَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ" کے اندازِ بلاغت سے حضرت عمرؓ تو سمجھ جائیں کہ آنحضور کو منافقین کیلئے دعائے مغفرت کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہیں دیا گیا۔ بلکہ اُن کیلئے دعاءِ مغفرت کرنے سے مطلقاً منع کردیا گیا ہے لیکن خود صاحبِ قرآن، قرآنی اندازِ فصاحت و بلاغت سے اُلٹا مفہوم اخذ فرمائیں کہ "استغفر لهم اولا تستغفر لهم" کے الفاظ میں آپ کو منافقوں کیلئے طلبِ مغفرت کرنے یا نہ کرنے کے دونوں اختیار عطا فرمائے گئے ہیں۔ اور اس اُلٹے مفہوم کی بنا پر، حضرت عمرؓ کے منع کرنے، بلکہ مصلّے پر سے کھینچنے کے باوجود ۹/۸ کی مخالفت کا ارتکاب کر بیٹھیں۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ حضرت عمرؓ کے فہمِ قرآن کی تصدیق، اور معاذ اللہ معاذ اللہ ثمّ معاذ اللہ معاذ اللہ آپ کے فہمِ قرآن کی تکذیب کرتے ہوئے، اس امر کی وضاحت کیلئے کہ آپ ۹/۸ کا مفہوم نہیں سمجھ پائے یہ آیت نازل کرے:۔

● وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا ۹/۸۴ = اور منافقوں میں سے کوئی مرجائے تو اس پر کبھی بھی صلوٰۃ (دعاءِ میت) نہ فرمانا۔ اور اُس کی قبر پر بھی کبھی کھڑے نہ ہونا۔ وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ۹/۸۴

المختصر! ابتدا میں واضح کیا جا چکا ہے کہ خدا تعالیٰ نے قیامت تک کی نوعِ انسانی کیلئے ضابطۂ حیات کے طور پر، جو آخری کتاب قرآن حکیم، رسولِ عربی سلام علیہ کے ذریعہ نازل فرمائی ہے۔ اُسکی تفصیل و تفسیر خود اُسکے اندر ہی موجود و محفوظ کردی گئی ہے۔ کتبِ روایات اس کی نہ تفسیر ہیں نہ تفصیل۔ اور مرّوجہ تراجم و تفاسیر میں باہمی اختلاف، اور ہر ایک کے اندر شکلی تضاد کی وجہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے فہمِ قرآن کے جو اصول و قواعد خود واضح کئے ہیں اُن پر توجہ دینے کی بجائے روایات کے اُس ذخیرے کو قرآن کریم کی رسولی تفسیر تسلیم کرلیا گیا ہے جس سے اُمت میں فرقہ بندی نے راہ پائی ہے۔ اور وہ ہر فرقہ کیلئے رسولی تفسیر کے نام سے اُسکی ضرورت کا مواد مہیّا کرتا ہے۔ اگر فہمِ قرآن کے قرآنی اصول و قواعد نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتے۔ اور قرآن کریم کی تفسیر کیلئے تفسیر القرآن بالقرآن کے انداز پر عمل کیا جاتا۔ تو نہ اُمت میں فرقوں کا وجود پیدا ہوتا۔ اور نہ ایک ایک آیت کے متعدد مختلف اور متضاد معنے لئے جاتے۔

ایک اہم نوٹ ذیل میں قرآن فہمی کے قرآنی اصول و قواعد، قرآنی دلائل و براہین کیساتھ بالترتیب نمبروار بیان کئے جا رہے ہیں۔ اور قارئین تفسیر القرآن بالقرآن پر واضح کیا جاتا ہے کہ اس ترجمہ اور تفسیر میں تفسیر بالرّائے کو ہرگز ہرگز راہ نہیں دی گئی، ہر مقام پر فہمِ قرآن کے قرآنی اصول و قواعد کی حدود و قیود کی پوری پوری پابندی کی گئی ہے۔

حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ ۝ ۳/۱۷۳ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ۝ ۸/۴۰

اب ملاحظہ فرمائیں خود قرآن کریم کے آئینے میں قرآن فہمی کے قرآنی اصول و قواعد:۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن فہمی کے قرآنی اصول و قواعد

۱۔ قرآن کی زبان عَرَبِیٌّ مُّبِین ہے

ارشادِ باری ہے :-

● اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ ۴۳/۳

(مفہوم) بیشک ہم نے اِس (اپنی نازل کردہ کتاب) کا پڑھنا عربی (شستہ) زبان میں ٹھہرایا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔

نیز فرمایا :-

● وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ ۝ $\frac{۲۶}{۱۹۲ \text{ تا } ۱۹۵}$ - اور بیشک قرآن کریم کا نازل کیا جانا، واضح اور شستہ عربی زبان میں رب العالمین کی طرف سے ہے۔ روح الامین اسے لیکر آپ کے قلبِ اطہر پر نازل ہوا۔ تاکہ آپ انبیاء کی اُس مقدس جماعت میں سے ہو جائیں، جو نوعِ انسانی کو اُن کے فرائضِ منصبی سے آگاہ کرنیوالی تھی۔

فلہٰذا قرآن فہمی کا پہلا اصول* یہ ہے کہ عربی زبان کے اصول وقواعد، اسکے سہ حرفی مادوں، اور عربی گرامر کو ہرگز ہرگز نظرانداز نہ کیا جائے۔ اِس ترجمہ اور تفسیر میں اِن اُمور کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

قرآنِ کریم زمانۂ جہالت کے لٹریچر کا محتاج نہیں

آیاتِ بالا کے اِن الفاظ سے، کہ قرآن ایسی واضح عربی میں نازل ہوا ہے جو خود مبین ہے یہ امر نکھر کر عیاں ہو رہا ہے کہ قرآن کی عربی میں نہ کوئی ابہام ہے نہ لسانی پیچیدگی ہے۔ ایسی زبان مرکزی شہروں کی ہوتی ہے۔ جہاں علم و ادب کے چرچے رہتے ہیں۔ دیہاتی اور بدوانہ زبان کو لِسَانٌ عَرَبِيٌّ مُّبِيْن ہرگز ہرگز نہیں کہا جا سکتا۔ قرآنِ کریم نازل ہوا تھا اُمّ القُریٰ مکہ معظمہؐ کی مرکزی بستی میں۔ لہٰذا شہری (مرکزی) زبان ہی عربیٌّ مُّبین، شستہ اور واضح کہلا سکتی ہے۔ اِسکے برعکس بدوانہ زبان کی حالت آج کے ترقی پذیر دور میں بھی یہ ہے کہ ہر دیہاتی زبان میں شستگی کی بجائے اکھڑپن پایا جاتا ہے اور تبیین کی بجائے ابہام ہوتا ہے۔ فلہٰذا یہ نظریہ قرآنِ کریم کی میزان پر پورا نہیں اُترتا کہ فہمِ قرآن زمانۂ جہالت کے بدوانہ لٹریچر اور اشعار کا محتاج ہے۔

* لفظِ اصول جمع کا صیغہ ہے جسکا واحد اصل ہے۔ اردو میں اس لفظِ اصول کا عمومی استعمال بطور واحد مروّج ہے۔ اسلئے بطور واحد استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن کریم کے سات قرأتوں میں نازل ہونے کا تصور قابلِ قبول نہیں

کتاب خداوندی کی ایک ہی زبان ہے عَرَبِیٌّ مُّبِینٌ ۲۶/۱۹۵، جو اپنی صفت مُبین کے مطابق سو فیصدی فصیح و بلیغ اور ہر قسم کی لسانی پیچیدگیوں سے مُبرّا اور مُنزّہ ہے۔ فلہذا روایات کا دیا ہوا یہ تصور بھی قابل قبول نہیں کہ قرآن کریم عربوں کے سات قبیلوں کی الگ الگ سات زبانوں، یعنی سات قرأتوں میں نازل ہوا تھا۔ اور ان قرأتوں میں معاذ اللہ معاذ اللہ اسقدر لفظی اور معنوی اختلافات موجود تھے کہ ایک قرأت والے دوسری قرأت کو سننے کی تاب بھی نہیں لا سکتے تھے۔ جیسے کہ بخاری شریف کتاب التوحید باب قولِ اللہ تعالیٰ فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ۷۳/۲۰ کی رسولی تفسیر، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت ہشام کو سورہ فرقان کی تلاوت ایسے الفاظ میں کرتے ہوئے سنا کہ نماز ہی میں ان پر حملہ کرنے کو تیار ہو گئے۔ روائت کے اصل الفاظ یہ ہیں:-

"یحییٰ بن بکیر، لیث، عقیل، ابن شہاب، عروہ، مسور بن مخرمہ، عبدالرحمٰن بن عبدالقاری، دونوں حضرت عمر بن خطاب سے روائت کرتے ہیں۔ کہ ان کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ میں نے ہشام بن حکیم کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سورہ فرقان پڑھتے ہوئے سنا تو دیکھا کہ وہ بہت سے ایسے حروف کیساتھ پڑھ رہے تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائے تھے۔ قریب تھا کہ میں نماز ہی میں ان پر حملہ کر دوں لیکن میں نے صبر کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے سلام پھیرا۔ تو میں نے چادر ان کے گلے میں ڈالدی اور کہا، تجھے یہ سورت کس نے پڑھائی ہے انہوں نے کہا رسول اللہ نے پڑھائی ہے میں نے کہا جسطرح تم پڑھتے ہو مجھے تو اسطرح نہیں پڑھایا ہے۔ چنانچہ میں ان کو کھینچتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے گیا۔ اور عرض کیا کہ میں نے ان کو سورہ فرقان ان طریقوں پر پڑھتے ہوئے سنا ہے۔ جو آپنے مجھے نہیں پڑھائے آپنے فرمایا کہ اسے چھوڑ دو۔ پھر فرمایا کہ اے ہشام پڑھو جس طرح میں نے ان کو پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ انہوں نے اسی طرح پڑھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرآن اسی طرح نازل کیا گیا ہے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اے عمر تم پڑھو۔ چنانچہ جس طرح آپنے مجھے پڑھایا تھا اسی طرح میں نے پڑھا۔ آپنے فرمایا کہ قرآن اسی طرح نازل کیا گیا ہے۔ یہ قرآن سات طریقوں پر اترا ہے۔ جو تم سے آسانی سے ہو سکے پڑھو۔
(بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد دوم صفحہ ۹۲۳)"

برادرانِ عزیز! کرۂ ارض کے گرد گھوم جایئے۔ آپ دیکھینگے کہ ہر زبان میں شہری اور دیہاتی کا فرق موجود ہے۔ ہر تیس چالیس میل کے بعد زبان کے صرف لب لہجہ اور طرزِ بیان ہی میں فرق نہیں آتا بلکہ الفاظ و حروف بھی مختلف ہو جاتے ہیں۔ لیکن کسی زبان میں الفاظ و حروف کا لاکھ اختلاف موجود ہو۔ مگر اس زبان والوں کی تعزیرات و قوانین اس اکلوتی مرکزی زبان ہی میں ہوتے ہیں، جس کے گرد اس زبان کا علم و ادب گردش کرتا ہے۔ یہی حال عربی زبان کا ہے۔ اس میں بھی مدنی اور بدوی یعنی شہری اور دیہاتی کا فرق موجود ہے۔ وہاں بھی ہر تیس چالیس میل کے لب و لہجہ اور الفاظ و حروف تک کا تغیر پایا جاتا ہے۔ چنانچہ آیات بالا ۴۳/۲ اور ۲۶/۱۹۲ تا ۱۹۵ میں اسی چیز کی خبر دیگئی ہے کہ عربی زبان اگرچہ سنّت اللہ کے مطابق مختلف زبانوں میں بٹی ہوئی ہے۔ لیکن ہم نے اپنے نازل کی کتاب عَرَبِیٌّ مُّبِینٌ شستہ اور واضح مرکزی زبان میں نازل فرمائی ہے۔ فلہذا مندرجہ بالا روائت کا مقصد عیاں ہے۔ کہ اگر اسے حدیث رسول مانا جائے تو قرآن کریم پایۂ اعتبار سے گر جاتا ہے۔ کہ یہ سات قسم کے مختلف و متضاد الفاظ میں نازل ہوا تھا جو الفاظ تم خود چاہو، اختیار کر لو۔ حالانکہ جَلَّتُہٗ

قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا ۴۳/۳، اور لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ..... بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ۞ ۲۶/۱۹۲-۱۹۵ کی قرآنی شہادت کے مطابق ثابت و بیّن ہے کہ قرآن کے الفاظ نزولی ہیں خود اختیاری نہیں۔ اور ایک ہی زبان عربی مبین میں نازل ہوئے ہیں۔ تو پھر یہ نظریہ کس طرح صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ قرآن سات قسم کے مختلف الفاظ میں نازل ہوا تھا یعنی روح الامین، قرانی آیات کریمات کو سات قسم کے الگ الگ الفاظ میں آنحضورؐ کے پاس لاتے تھے۔ اور حضورؐ ایک ہی آئت، حضرتِ ہشام کو کسی اور الفاظ میں پڑھاتے تھے۔ اور حضرت عمرؓ کو کسی اور الفاظ میں۔ العیاذ باللہ!

۲- الفاظ کی حاکمیت ہمیشہ ہمیشہ قائم رکھی جائیگی

جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے کہ ۴۳/۳ اور ۲۶/۱۹۲ تا ۱۹۵ کے مطابق قرآن کا نزول عربی زبان میں ہوا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ زبان مشتمل ہوتی ہے الفاظ پر۔ اور قرآن کے الفاظ خود اختیاری نہیں بلکہ نزولی ہیں۔ نیز ظاہر ہے کہ معانی اور مفہوم الفاظ ہی کے ہوتے ہیں۔ اور وہ خود الفاظ ہی کے اندر موجود و محفوظ ہوتے ہیں۔ فلہذا :-

قرآن فہمی کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ہر مقام پر خداوند علیم و حاکم کے نازل کردہ الفاظ کی حاکمیت قائم رکھی جائے بحمد اللہ کہ اس ترجمہ و تفسیر میں کسی ایک لفظ کے ترجمہ اور مفہوم سے پہلو تہی نہیں کیگئی۔ سوائے اُن حروفِ جارہ کے جو عربی ادب میں قواعدِ عرب کے مطابق زائد لائے جاتے ہیں۔ مثلاً :-

● لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ ۞ ۸۸/۲۲ میں بِمُصَیْطِرٍ کی ب، قاعدۂ عرب کے مطابق زائد ہے۔ اِسکا صحیح مفہوم یہ نہیں ہے کہ :- اے رسول آپ لوگوں کیلئے کسی داروغہ کیساتھ نہیں ؟ —— بلکہ صحیح مفہوم یہ ہے کہ :- آپ لوگوں کیلئے کوئی داروغے نہیں ہیں۔

نیز قرآن کی زبان میں جو ضمائر کا تکرار ہے، اُنکا ترجمہ بلا تکرار کیا گیا ہے۔ مثلاً اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ ۷۶/۲۳ میں ضمیر جمع متکلم کا سہ گانہ تکرار تاکیدی ہے۔ اِسکا ترجمہ اس طرح نہیں کیا گیا کہ :- قرآن کو بیشک ہم نے، ہم نے ہم نے نازل کیا ہے۔ بلکہ غرض تکرار کو نمایاں کرتے ہوئے، ترجمہ لکھا گیا ہے :- بلاشبہ قرآن کو ہم ہی نے نازل کیا ہے۔

نیز الفاظ کی حاکمیت کو قائم رکھتے ہوئے اِس ترجمہ اور تفسیر میں کسی لفظ کا وہ مفہوم کبھی ہرگز نہیں لیا گیا، جو الفاظ کی حدود و قیود سے بے نیاز ہو کر لفظی حدود کو توڑ کر رکھدے۔ مثلاً سابقہ تراجم میں ۴/۱۱ کے الفاظ ”فَوْقَ اثْنَتَیْنِ“ کا معنیٰ لیا گیا ہے دو یا دو سے زائد لڑکیاں۔

۳- قرآن کریم اہل عرب کی روزمرہ کی بول چال کے عین مطابق ہے

ارشادِ باری ہے :-

● فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ۞

۵۱/۲۳ (مفہوم) آسمان اور زمین (بلندی اور پستی) کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ قرآن حق ہے۔ اِسکا اندازِ کلام بالکل اُس طرح کا ہے جس طرح تم آپس میں گفتگو کرتے ہو۔ فلہذا اس آئت مجیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ جس طرح روزمرہ کی عام بول چال، حقیقت و مجاز اور استعارات و تشبیہات، ہر چیز کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے

فی الارض کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں۔ یعنی تصوّر دیا جاتا ہے کہ نعماءِ خداوندی پر متصرّف افراد جس طرح چاہیں ضروریاتِ زندگی کی ناہموار تقسیم کرتے چلے جائیں۔

۳- ● ربوبیّت عامہ کے خداوندی توازن کو عملاً ختم کر کے روزِ جزا (یوم الدّین) کا عملی انکار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ زبان سے مسلسل اقرار کیا جا رہا ہو۔

۴- ● خدا تعالیٰ نے جن چیزوں کو باہم ملانے یعنی متوصّل کرنے کا حکم دیا ہے انہیں ملانے کی بجائے جُدا کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً:-

ا۔ سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کیساتھ عہد تو کیا جاتا ہے کہ تیری عبادت اور استعانت کو صرف تیرے لئے مخصوص رکھتے ہوئے، اِن کا اتّصال قائم رکھیں گے۔ لیکن یہ پکّا عہد، جو اِیّاکَ کی ضمیر مقدّم کے حصر کیساتھ دو مرتبہ کے تکرار، اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ [1] کے الفاظ میں بار بار کیا جاتا ہے، اُسے اِس طرح توڑا جاتا، اور عبادت و استعانت کے اتصال کو اس طرح منقطع کیا جاتا ہے کہ نماز پڑھی جاتی ہے اللہ کی۔ اور مُرادیں مانگی جاتی ہیں غیر اللہ سے۔

ب- نیز خدا تعالیٰ نے محکمات و متشابہات کے باہم وصل کرنے کا حکم دیا ہے [2] لیکن محکمات و متشابہات کے تصوّر تک کو گم کر کے، متشابہات کو محکمات سے جُدا کرتے ہوئے من مانی تاویلوں کیساتھ ابتغاءِ فتنہ اور فساد فی الارض کیا جاتا ہے۔

ج- قرآن کریم کے مختلف عنوانات کو فہرستِ قرآن کیساتھ متوصّل کرنا ضروری نہیں مانا جاتا۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے اُنکے وصل کا حکم دیا ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِیْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِیْمَ ۝ [15/87]

۵- ● دُعا مانگی جاتی ہے: مندرجہ بالا متوازن نظامِ ربوبیّت والے صراطِ مستقیم کی، لیکن غیر متوازن تقدیروں کے عقیدہ کے ذریعہ اِسکی شبانہ روز عملاً مخالفت کی جاتی ہے۔

۶-۷ ● خدا تعالیٰ نے اپنے تمام نبی رسولوں کی سو فیصدی عصمت کا وعدہ لیا ہے لیکن اُن کی طرف جھوٹ، چوری اور دھوکا فریب وغیرہ تک منسوب کر کے اِس عہد کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ حضرت یوسفؑ پر بھائی کو چور بنانے کا الزام، حضرت ابراہیمؑ پر تین مرتبہ جھوٹ بولنے کا بہتان، اور حضرت داؤدؑ پر دھوکے سے پرائی عورت حاصل کرنے کا افتراء باندھکر عہدِ خداوندی کو توڑا جاتا، اور انبیاء سلام علیہم کو صراطِ مستقیم سے ہٹا ہُوا ثابت کیا جاتا ہے۔ نیز خدا تعالیٰ نے وعدہ لیا ہے کہ تمام نبی رسولوں پر اسکا کبھی غصّہ نہیں ہُوا تھا۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اِس مقدّس جماعت پر اللہ کے غصّے کا ثبوت مہیا کرتے ہوئے، کسی نبی کو آرے سے چروایا جاتا ہے۔ کسی کے بدن میں کیڑے ڈلوائے جاتے اور کسی کی حکومت چھنوا کر اُس سے مچھیروں کی نوکری کروائی جاتی ہے۔ کسی کو

---

[1] اہلِ روایات کے ہاں بھی سورہ فاتحہ کو قرآنِ کریم کی فہرست تو تسلیم کیا گیا ہے لیکن قرآن اور اُسکے دیباچہ کو باہم متوصّل نہیں کیا جاتا حالانکہ ارشادِ باری ہے:- وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ یَتَذَكَّرُوْنَ ۝ [28/51]، اور بالتحقیق ہم نے اپنے قول کو باہم متوصّل کر دیا۔ تاکہ لوگ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

حالانکہ فی الحقیقت نہ وہ گونگے ہوتے ہیں نہ بہرے نہ اندھے۔ چونکہ وہ گونگوں بہروں اور اندھوں کی طرح حقائق سے بے خبر رہتے ہیں۔ اِس لئے اِس مشابہت کی بنا پر اُنہیں گونگے بہرے اور اندھے کہا گیا ہے۔ اور اِس کی وضاحت آیت ذیل میں کر دی گئی ہے:-

● لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ 7/179

(مفہوم) اُن کے پاس قلوب ہیں مگر اُن کے ساتھ تفقہ نہیں کرتے۔ اُن کے پاس آنکھیں ہیں، اُن سے دیکھتے نہیں۔ اُن کے پاس کان ہیں اُن سے سُنتے نہیں۔ اِس آیت مجیدہ نے اِس امر کی تفسیر و تشریح کر دی ہے کہ 2/18 میں جنہیں گونگے بہرے اور اندھے کہا گیا ہے۔ وہ فی الحقیقت گونگے بہرے اور اندھے نہیں، اُنہیں گونگوں، بہروں اور اندھوں کیساتھ مشابہت کی بنا پر کاف تشبیہ محذوف رکھکر کہا گیا ہے کہ وہ گونگوں جیسے ہیں، بہروں جیسے ہیں اور اندھوں جیسے ہیں۔ پس **قرآن فہمی کا پانچواں اصول یہ ہے کہ:-**

قرآن حکیم میں تشبیہات کا انداز حرفِ تشبیہ مذکور کیساتھ بھی ہے اور محذوف کیساتھ بھی

۶- استعارات کا استعمال روزمرّہ کی بول چال میں جہاں حقیقت، مجاز اور تشبیہات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ وہاں الفاظ استعارات کے طور پر بھی بولے جاتے ہیں۔ سورہ دہر میں جنّتی معاشرہ کے نوخیز بچوں کیلئے یہ الفاظ آئے ہیں:- ● إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا ۝ 76/19

(مفہوم) اے مخاطب جب تو اُن (مسرور، خوش باش اور تازہ چہروں والے) بچوں کو چلتا پھرتا دیکھے تو گمان کرے کہ یہ درخشندہ اور تابناک جواہرات بکھرے ہوئے ہیں — یعنی اُنکے چہرے ناہموار معاشرہ کے بچوں جیسے مضمحل اور اُداس پریشان نہیں ہونگے۔ دیکھیئگا! یہاں لُؤْلُؤًا مَّنثُورًا سے تازگی (و شگفتگی) اور درخشندگی استعارۃً لی گئی ہے۔ ورنہ اِن الفاظ کے حقیقی معنوں کے مطابق اِن بچوں کے متعلق یہ نہیں کہا گیا کہ وہ فی الحقیقت جواہرات یعنی پتھر کے بنے ہوئے ہونگے۔ پس **قرآن فہمی کا چھٹا اصول یہ ہے کہ:-**

قرآن حکیم میں حقیقت، مجاز اور تشبیہات کیساتھ ساتھ استعارات بھی موجود ہیں۔

فلہٰذا اللہ تعالیٰ کے خود واضح کردہ اصول کے مطابق کہ قرآن کریم روزمرّہ کی بول چال کے عین مطابق ہے 44/58۔ اِس ترجمہ و تفسیر میں ہر اُس مقام پر جہاں الفاظ کے حقیقی معنے مُراد لینے میں مشاہدات معارض ہیں، وہاں مجازی تشبیہی یا استعاراتی معنے لیئے گئے ہیں۔ اور کسی بھی مقام پر کسی چیستانی تصوّر کو قریب تک پھٹکنے نہیں دیا گیا۔ جو مشاہدات و تجربات کے خلاف ہو۔

۷۔ قرآن حکیم اللہ کا قول اور کائنات اسکا فعل ہے اللہ کے قول و فعل میں تضاد و تخالف ہرگز نہیں

یہ ایک عالمگیر مسلّمہ ہے کہ خود انسانوں میں بھی معقول انسان کی پہچان یہ ہے کہ اسکے قول اور فعل میں تضاد و تخالف نہیں ہوتا۔ تو اس طرح خداوندِ عالم، صاحب شرفِ مجد کے متعلق تو اس امر کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا کہ اسکا کوئی قول اسکے کسی فعل کے خلاف ہو۔ قرآن کریم میں اِس امر کی وضاحت باندازِ ذیل کیگئی ہے :-

- خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۶۴/۳ = اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو بالحق پیدا فرمایا ہے۔
- نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۳/۳ = اے رسول! اللہ نے آپ پر اپنی کتاب بالحق نازل فرمائی ہے۔

دیکھیئگا! اِن آیات کریمات میں بالصراحت بتا دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فعل کائنات بھی بالحق ہے۔ اور اسکا قول قرآن بھی بالحق ہے۔ اب چونکہ حق، حق کا مخالف ہرگز ہرگز نہیں ہوتا۔ پس ثابت ہُوا کہ قرآن اور کائنات، یعنی خدا تعالیٰ کا قول و فعل باہم موافق ہیں مخالف نہیں۔ بالفاظِ دیگر قرآن کریم کی کوئی آیت، کتاب کائنات کی کسی آیت کے خلاف ہرگز نہیں۔ اور اِسی طرح کتاب کائنات کی کوئی آیت، قرآن کریم کی کسی آیت کی مخالف نہیں۔

مثلاً ارشادِ باری ہے :- • اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ ثَمَرٰتٍ مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهَا ۲۷/۳۵ = اے مخاطب کیا تُو نے غور نہیں کیا، یعنی تجھے غور کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ آسمان سے پانی نازل کرتا ہے۔ پھر ہم اسکے ساتھ مختلف رنگوں کے میوہ جات پیدا کرتے ہیں ـــــ یہ جیسے اللہ تعالیٰ کا قول جو نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۳/۳ کی قرآنی شہادت کے مطابق حق ہے۔ وہ آسمان سے عملی طور پر پانی برسانا اور اسکے ساتھ انواع و اقسام کے میوہ جات پیدا کرنا، جو اِس کائنات میں بشکل مشہود موجود ہے۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۶۴/۳ کے مطابق حق ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کا قول ہے۔ اور یہ اسکا فعل ہے۔ اور یہ باہم موافق ہیں، ایک دوسرے کے مخالف نہیں۔

پس قرآن فہمی کا ساتواں اصول یہ ہے کہ اس کی کوئی آیت کتاب کائنات کے مخالف ہرگز نہیں،

فلہٰذا اِس ترجمہ و تفسیر میں قرآن کریم کی کسی بھی آیت کا مفہوم، کتاب کائنات کی کسی آیت کے خلاف نہیں لیا گیا۔ اور قرآن کریم کے جن الفاظ کے حقیقی معنے کتاب کائنات کے مخالف جاتے ہوں۔ اصول ۳ کے مطابق اُن کے وہ مجازی، تشبیہاتی یا استعاراتی معنے لئے گئے ہیں۔ جو کتاب کائنات کے عین موافق ہیں۔ پس قرآن فہمی کے اصول زیرِ نظر کے مطابق، قرآن کریم میں کسی حیاتی تصور کو داخل نہیں ہونے دیا گیا جس سے قرآن و کائنات میں تضاد پایا جائے۔

۸۔ قرآن ایک مفصّل کتاب ہے مجمل نہیں

خدا تعالیٰ نے، اُسی ذاتِ اقدس و اطہر کی زبانِ فیض ترجمان سے، جس کے قلب اطہر پر یہ قرآن کریم نازل ہُوا تھا (۹۷/۲)، اِس امر کا اعلان کروا دیا ہے کہ یہ کتاب مجید مفصّل ہے مجمل ہرگز نہیں :-

- اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ۱۱۴/۶

تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۲۶۷

آنکھ موند لو یہ آپکے اور جانو یہ کہ اللہ تعالیٰ بے پرواہ ہے تعریف کیا گیا۔

صاحبِ حمد ہے۔ (تم جو بھی خرچ کرو گے، تمہارے اپنے ہی فائدے کیلئے ہوگا)

● آیتِ بالا میں ناہموار معاشرہ کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ باسی روٹی، پھٹا پرانا کپڑا، اور اُتار پھینکے ہوئے جوتے راہِ خدا میں دیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ انفرادی نظام کے ناہموار معاشرے میں کچھ بعید نہیں کہ یہی حالت تمہاری ہو جائے، اور یہی ردّی چیزیں تمہیں دی جا رہی ہوں۔ یہ تو ہوئی مَاكَسَبْتُمْ کی حالت۔ اور مِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ کی حالت یہ ہوتی ہے کہ حکام کے گھر مٹی کے تیل کے کنستر پہنچتے رہتے ہیں، اور عوام بچاروں کو ایک بوتل کیلئے گھنٹوں قطاروں میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ سرمایہ داروں کے ہاں سوئی گیس پرانی بھی ہو چکی ہے۔ مگر عوام اُسکے فوائد سے کیا، نام تک سے بے خبر پائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے زمینداروں کے ٹیوب ویل چل رہے ہوتے ہیں، مگر چھوٹے بیچارے رہٹ اور بیلوں ہی کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں۔ یہ سب کچھ انفرادی اور سرمایہ داری نظام ہی کی بدولت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے ان مجملہ خرابیوں اور ناہمواریوں کا آخری حل $\frac{9}{111}$ میں پیش کر دیا ہے کہ مَاكَسَبْتُمْ اور مِمَّآ اَخْرَجْنَا مِّنَ الْاَرْضِ، ہر چیز قومی ملکیت قرار دی جائے۔ اور بلاتمیز ہموار تقسیم کیساتھ معاشرہ کو ہمیشہ جنّت بدوش رکھا جائے۔

نفس کی شرارت

اگلی آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ انسان کو اُس کا نفسِ امّارہ (شیطان) اُسے بھوک ننگ کا وعدہ دیتا ہے:۔

اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ

شیطان وعدہ دیتا ہے تمکو فقر کا اور حکم کرتا ہے تمکو

بِالْفَحْشَاۗءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ

ساتھ بےحیائی کے اور اللہ تعالیٰ وعدہ دیتا ہے تم کو بخشش کا اپنی طرف

وَفَضْلًا ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۲۶۸

سے اور فضل کا اور اللہ کشائش والا جاننے والا ہے۔

(یاد رکھو کہ) شیطان تمہیں (اجتماعی نظام سے روک کر انفرادیت کے ذریعہ) محتاجی کا وعدہ دیتا ہے (اور تمہیں بخیلی (ذاتی مفاد طلبی انفرادیت) کا حکم کرتا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ تمہیں (اجتماعی نظام کے ذریعہ ہمیشہ کیلئے محتاجی دمحرومی سے) محفوظ کرنے کا، اور اپنے فضل (یعنی جنتی معاشرہ) کا وعدہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ وسعت دینے والا، خوب جاننے والا ہے۔

● آیتِ بالا کے آخری الفاظ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ میں واضح کیا گیا ہے کہ بلاتمیز ہر ایک کیلئے دائمی وسعت اُس اجتماعی نظام ہی میں مرکوز ہے، جو خود اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ کیونکہ وہ بڑھکر جاننے والا ہے کہ انفرادی اور سرمایہ داری نظام میں امن و توازن قائم نہیں رہ سکتا۔ حکّام اپنی جگہ آئین کا مذاق اُڑاتے رہتے ہیں اور عوام اپنی جگہ قانون کی دھجیاں بکھیرتے رہتے ہیں کیونکہ دونوں کی غرض الگ الگ ذاتی مفاد ہی ہوتی ہے۔

عنہ الفحشا کا معنی لکھا گیا ہے بخیلی ذاتی مفاد طلبی۔ اسکا سہ حرفی مادہ ف۔ ح۔ ش۔ فحش ہے جسکا بنیادی معنی

چونکہ دُنیا کا کوئی فرد و بشر خدا تعالیٰ کے غیر محدود علم کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اِسلئے اُسکی کتاب کا کوئی متنفس مفسّر و مبیّن نہیں ہو سکتا اپنی کتاب کا مفسّر و مفصّل وُہ آپ ہے۔ لیکن حضور رسالتمآبؐ کو کتاب مجید کا مفسّر قرار دینے والے اپنے اِس اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ اور رسُولِ مقبول کے ذریعہ تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کا قرآنی حصار توڑ کر، پھر اِس میں بغویؒ، بیضاویؒ، ابن اثیرؒ اور ابن کثیرؒ وغیرہم کو داخل تو کر لیا جاتا ہے، لیکن افسوس ہے کہ ایک ایک آیت کی متعدد اور مختلف و متضاد تفسیریں پیش کر کے تفسیر قرآن کے خواب کو پریشان سے پریشان تر کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

لیکن حقیقت یہی ہے کہ ۱۶/۸۹ کے داخلی دعوے کیمطابق قرآن کریم، سو فیصدی نہیں، بلکہ کئی سو فیصدی تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ ہے۔ یاد رہے کہ اگر اِسے اِسکے اِس دعوٰی کے خلاف تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ نہ مانا جائے تو نہ یہ ہدایت ثابت ہوتا ہے نہ رحمت و بشارت ٹھہرتا ہے کیونکہ ۱۶/۸۹ میں معطوف معطوف علیہ کی صورت میں کہا گیا ہے، کہ قرآن کریم تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ ہے۔ اہل قواعد سے یہ امر مخفی نہیں، کہ معطوف معطوف علیہ کے حکم میں ہوتا ہے۔ تو اِس طرح جب قرآن کریم، سو فیصدی، ہدایت، رحمت اور بشارت ہے۔ تو سو فیصدی تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ کیوں نہیں؟ کاش کہ عربی قواعد ہی کا پاس کرتے ہوئے کتاب خداوندی کو اُسی طرح لامحتاج الی الغیر تسلیم کیا جائے، جس طرح خود صاحب کتاب، خدا تعالیٰ کو "لامحتاج الی الغیر" تسلیم کیا جاتا ہے۔

ایک ضمنی سوال کا جواب

کہا جاتا ہے کہ سینکڑوں مسائل ایسے ہیں، جن کا جواب دینے سے قرآن قاصر ہے۔ یعنی یہ نہیں بتاتا کہ کس طرح کھاؤ، کس طرح پیو، کس طرح اُٹھو، کس طرح بیٹھو۔ لباس کونسا پہنو۔ حجامت کس وضع کی بناؤ۔ نماز کس طرح پڑھو۔ کتنے وقت پڑھو اور اُس میں کیا پڑھو۔ الگ الگ وقتوں کی کتنی کتنی رکعتیں ادا کرو۔ زکوٰۃ کا نصاب کیا ہے اور مقدار کیا؟ حج کس طرح ادا ہو گا؟ میت کو غسل کس طرح دیا جائیگا؟ جنازہ کس طرح ہو گا؟ بچہ پیدا ہو تو اُسکے کان میں اذان کہنے کی خبر قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن نکاح باندھنے کا طریقہ نہیں بتاتا۔ طریقۂ طلاق کی وضاحت نہیں کرتا وغیرہ وغیرہ۔

اِس قسم کے سوالات کرنے میں وہی ذہن کارفرما ہوتا ہے، جو قرآن کریم کو ناکافی، نامکمل اور مجمل و گونگا ماننے کیساتھ ساتھ دامن اِسلام کو اِسقدر محدود اور سمٹا سکڑا ہوا تسلیم کرتا ہے جو جغرافیائی تقاضوں کا خیال بھی نہ رکھے اور انسان کی انفرادی پسند اور شخصی آزادی تک کو بھی سلب کر لے یعنی اتنی شدید پابندیاں عائد کر دے، کہ کھاؤ تو یوں، پیو تو یوں۔ اُٹھو تو اِس طرح، بیٹھو تو اِس طرح لیٹو تو اِس پہلو۔ سوؤ تو اِس کروٹ۔ بیت الخلاء میں داخل ہو تو یہ پڑھو۔ باہر آؤ تو یہ دُہراؤ۔ یاد رہے! قرآن کریم چونکہ هُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ہے ـــــ رسُولِ مقبول چونکہ دُنیا بھر کے رسُول ہیں۔ اور اسلام چونکہ عالمگیر دین ہے۔ اِسلئے نہ اِس میں بے جا پابندیوں کی گنجائش ہے، نہ تو ہماتی جکڑبندیوں کا گزر۔ اِس میں صاف صاف کہہ دیا گیا ہے کہ واجب الاتباع صرف مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ یعنی قرآن کریم ہے (۷/۳) اور اِسی کی تائید ۲۸/۸۵ میں کیگئی ہے۔ ● اِنَّ الَّذِىْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ ؕ اے رسول! وُہ ذاتِ مقدس جس نے آپ پر قرآن فرض کیا ہے وہ آپ کو وعدہ گاہ (قیامت) کی طرف سے لے جانیوالا ہے۔ بالفاظ دیگر مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ

یعنی قرآن کریم ہی آنحضورؐ اور اُمّتِ مُسلمہ پر فرض کیا گیا ہے۔ اور قیامت کو بازپُرس بھی قرآن کریم ہی کے متعلق ہوگی۔ جیسے کہ سورۂ فرقان میں خبر دیگئی ہے کہ قیامت کی وعدہ گاہ میں قرآن کریم ہی کو پسِ پُشت پھینک دینے کا جُرم اُمّت پر عائد ہوگا۔ اور رسُولِ مقبول فرمائینگے :-

● یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ○ ٢٥/٣٠ = اے میرے پروردگار میری اِس قوم نے قرآن کو اِس طرح پکڑا ہُوا تھا جیسے چھوڑا ہُوا ہوتا ہے ــــ قرآن کے سوا جن کتابوں کو اِسکے ساتھ شریک کرکے واجب الاتّباع گردانا جاتا ہے یعنی کُتبِ روایات، نہ قرآن بھر میں اُن کی اتّباع کا حکم دیا گیا ہے۔ اور نہ قیامت کی بازپُرس میں اُنکا ذکر ہے فلہذا ثابت ہُوا کہ قیامت کی بازپُرس کا مکمّل حل قرآنِ مجید میں موجود ہے۔ یہی **فرض** ہے۔ یہی **واجب الاتباع** ہے۔ جو مسائل اِس میں دیدیئے گئے ہیں۔ وُہی فرض ہیں۔ خواہ وہ مسئلہ صلوٰۃ سے متعلق ہوں، یا زکوٰۃ سے۔ اُنکا تعلق اوقاتِ الصلوٰۃ کے ساتھ ہو، یا رکعات و اذکارِ صلوٰۃ کے ساتھ۔ وہ مسائل حج ہوں یا مسائل نکاح و طلاق۔ زندوں کے مسئلے ہوں یا مُردوں کے۔ جو کچھ قرآن کریم میں دیدیا گیا ہے وُہی کچھ فرض ہے۔ اور جن مسائل کی وضاحت نہیں کیگئی، ظاہر ہے کہ وُہ خداوندِ علیم و خبیر سے مجہُول کر نہیں رہ گئے۔ بلکہ اُنہیں ہر ملک کے موسمی اور جغرافیائی تقاضوں، اور ہر فرد کی شخصی آزادی اور انفرادی پسند پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ ورنہ خداتعالیٰ نے، قرآنِ کریم کے متعلق تو پُوری ذمہ داری کیساتھ اعلان کر رکھا ہے کہ وہ ہر مسئلہ، اور ہر مسئلے کے ہر گوشے کو پُوری طرح کھول کھولکر بیان کرنیوالی کتاب ہے :-

● وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ١٦/٨٩ = اے رسُول! ہم نے آپ پر ہر مسئلہ کو کھول کھولکر بیان کرنے والی کتاب نازل فرمائی ہے۔

● وَكُلَّ شَيْءٍ فَصَّلْنٰهُ تَفْصِيْلًا ○ ١٧/١٢ = اور ہم نے ہر مسئلے کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی حکم دیدیا گیا ہے کہ جو مسائل، اور مسائل کے جو گوشے بیان نہیں کیئے گئے اُن کے متعلق کرید نہ کرنا :-

● یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ ٥/١٠١ = ایمان والو! اُن مسائل کے متعلق سوال نہ کرنا (جو زمان و مکان کے تقاضوں اور اقوام و افراد کی انفرادی آزادی پر چھوڑ دیئے گئے ہیں) اگر سب بتا دیئے جائیں (تو تمہاری شخصی آزادی چِھن جائے اور) تمہارے لئے تنگی اور دشواری کا موجب ہو جائے ــــ بالفاظِ دیگر ١٦/٨٩ اور ١٧/١٢ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ ہم نے اپنی کتاب میں انسانی ضروریات کے تمام مسائل پُوری طرح کھول کھول کر بیان کر دیئے ہیں۔ اور ٥/١٠١ میں منع کر دیا گیا ہے کہ قرآنی وضاحت و صراحت سے زائد سوال نہ کرنا جن مسائل کی فروعات سے درگزر کیا گیا ہے۔ وہ مکان و زمان کے تقاضوں اور تمہاری انفرادی آزادی کے پیشِ نظر خود معاف فرمایا ہے۔ قرآن میں کوئی کمی کجی نہیں رکھی گئی۔

صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، پیدائش و موت، نکاح و طلاق اور جملہ معاشرتی مسائل کی اصولی حدود و قیود متعیّن کر دیگئی ہیں۔ اور ان غیر متبدل حدود کے دائرے میں مکان و زمان کی ضرورتوں کے مطابق نوعِ انسانی کو انفرادی آزادی عطا کر دی ہے۔ نیز جس حد تک کسی

مسئلے کی فروعی شقّوں کو پابند کرنا ضروری تھا۔ اُس حد تک اصُول کیساتھ ساتھ فروعات کی وضاحت و صراحت بھی کر دیگئی ہے اور باقی گوشے آزاد چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ مثلاً یہ حکم تو دیا ہے:۔ ● یٰبَنِیْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَیْكُمْ لِبَاسًا یُّوَارِیْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِیْشًا ۷/۲۶ اے نوعِ آدم! بیشک ہم نے تم پر لباس (کا حکم) نازل کیا ہے کہ وہ تمہاری برہنگی کو ڈھانپے اور خوبصورت بھی ہو۔ لیکن اس حکم کی عالمگیریت کو قائم رکھتے ہوئے یہ پابندی نہیں لگائی گئی کہ صرف تہبند اور لمبا کرتہ ہی پہنا جائے۔ کوٹ پتلون اور قمیض شلوار یا چست پاجامہ اور شیروانی استعمال نہ کیجائے! اسی طرح حجامت کے متعلق مُحَلِّقِیْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِیْنَ ۴۸/۲۷ کے الفاظ میں رُءُوس، جن میں سر اور ڈاڑھی کے سب بال شامل ہیں[1]، مُنڈانے یا کتروانے کی اجازت تو موجود ہے لیکن یہ پابندی نہیں کہ ضرور ہی مُنڈائے جائیں یا ضروری کتروائے جائیں۔ کٹائے جائیں تو کتنی لمبائی تک اور کس مُلک کی وضع قطع کے مطابق کٹائے جائیں۔ بلکہ پورے کرۂ ارض کے قیامت تک کے تقاضوں کا ساتھ دینے کیلئے، ان گوشوں کو آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔

● کھانے پینے کے متعلق كُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا ۷/۳۱ کھاؤ پیئو مگر اسراف نہ کرنا ـــــ اور كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۵/۸۸ کے الفاظ میں حلال پر موافق مزاج کی اجازت دیدی گئی ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ہر حلال چیز کے کھانے پر مجبور نہیں کیا گیا۔ کوئی چیز حلال ہونے کیساتھ ساتھ، اگر صحت اور مزاج کے موافق نہ ہو تو نہ کھائے! اسی طرح انفرادی مزاج اور پسند کو برقرار رکھتے ہوئے حکم دیا گیا ہے کہ جی چاہے تو ایک برتن میں مِلکر کھاؤ، نہ چاہے تو الگ الگ برتنوں میں کھا سکتے ہو:۔ لَیْسَ عَلَیْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَاْكُلُوْا جَمِیْعًا اَوْ اَشْتَاتًا ط ۲۴/۶۱

● اقامتِ صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کو ہر مقام پر متصل لاکر، اسے اس طرح مرکزی نقطہ کی حیثیت دیدی گئی ہے کہ قرآن کریم کی پوری تعلیم اسکے گرد طواف کرتی ہوئی پائی جاتی ہے۔ الفاظ صلوٰۃ و زکوٰۃ، اور ان کی مکمل تشریح اپنے مقام پر آگے آرہی ہے۔ یہاں صرف یہ بتایا جاتا ہے کہ قرآن کریم کے متعلق یہ کہنا کہ اس میں صلوٰۃ و زکوٰۃ کی وضاحت موجود نہیں، گویا یہ تصوّر دینا ہے کہ جس مقصد کیلئے قرآن کریم نازل ہُوا تھا۔ اس نے خود اُسکی حقیقت کو بھی بے نقاب نہیں کیا۔

---

[1] قرآنی لُغت کیمطابق راس سے پورا سر ہی مُراد لیا جاتا ہے۔ صرف بالائی سطح نہیں۔ ۱۷/۵۱ میں ہے فَسَیُنْغِضُوْنَ اِلَیْكَ رُءُوْسَهُمْ وَیَقُوْلُوْنَ مَتٰى هُوَ ط اے رسول! وہ آپ سے مخاطب ہو کر سروں کو مٹکائینگے اور کہینگے (جس قیامت کی آپ خبر دیتے ہیں۔ بتائیے گا کہ) وہ ہوگی کب؟ چونکہ صرف سر کی بالائی سطح ہلائی اور مٹکائی نہیں جاسکتی، بلکہ سارا سر حرکت کرتا ہے! اسلئے ڈاڑھی سمیت سارے سر کے بالوں کو حسب منشا منڈانے یا کتروانے کی اجازت ہے۔ ۱۹/۴ میں حضرت زکریا کا قول درج ہے وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَیْبًا ۔ میرا سر شعلہ مار چکا ہے یعنی میرے راس کے بال سفید ہو چکے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ صرف سر کی بالائی سطح کے بال ہی سفید نہیں ہو چکے تھے بلکہ ڈاڑھی بھی سفید ہو چکی تھی ـــــ لہٰذا ۱۹/۴ میں بھی ڈاڑھی سمیت پورے سر کو راس کہا گیا ہے ۵/۶ وضو کے ضمن میں سر یعنی سر کی بالائی سطح بھی آیا ہے:۔ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ لیکن ۱۷/۵۱ اور ۱۹/۴ میں راس یعنی ٹھوڑی سمیت سارا سر ہے، صرف بالائی سطح نہیں۔ اس سلسلے کی مزید وضاحت آیت ۵/۶ کی تفسیر میں، تفسیر القرآن بالقرآن کے ماتحت اپنے مقام پر آگے آرہی ہے۔

● نکاح وطلاق اور دفن کفن وغیرہ الفاظ کا مفہوم خود ان الفاظ کے اندر موجود ہے۔ وضاحت اپنے مقام پر آگے آرہی ہے۔ باقی رہا تو مولود کے کان میں اذان کہنے کا مسئلہ تو جب قرآن کریم یہ کہتا ہے۔ ● وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا [۱۶] = اور اللہ تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کرتا ہے اس وقت تم کچھ نہیں جانتے —— تو ایسے وقت پر جب بچہ جانتا ہی نہیں کہ اسے کیا کہا جا رہا ہے۔ بول و براز تک کے شعور سے عاری ہے۔ اٹھ کر بیٹھ نہیں سکتا مسجد جا نہیں سکتا، اسکے ایک کان میں یہ کہنا حَیَّ عَلَی الصَّلٰوۃ، آ نماز کی طرف۔ اور دوسرے میں کہنا۔ قَدْ قَامَتِ الصَّلٰوۃ = جلدی کر جماعت کھڑی ہو گئی ہے۔ قرآن کریم جیسی عقل دوست کتاب سے، جو لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ اور اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ کے جملوں سے معمور ہے، ایسے عقل دشمن احکام کی امید رکھنا، اسکے مقام تک سے بے خبری کی دلیل ہے۔

پس **قرآن فہمی کا نواں اصول** یہ ہے کہ قرآن کریم خود مبین ہے۔ ہر مسئلے کی خود وضاحت کرتا ہے اور تبیین وتشریح کیلئے کسی غیر اللہ کتاب کا محتاج نہیں۔

۱۰۔ قرآن کریم کافی ہے

ارشادِ باری ہے:۔
● اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ○ [۲۹/۵۱] = صاحب قرآن! کیا معترضین کیلئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے۔ جو ان پر پڑھی جاتی ہے۔ بلا شبہ ماننے والوں کیلئے اس میں رحمت بھی ہے اور نصیحت بھی ہے۔

غور فرمائیگا کہ اس آیت مجیدہ میں کس اندازِ بلاغت کیساتھ کفائتِ قرآن کا اعلان کیا گیا ہے۔

پس **قرآن فہمی کا دسواں اصول** یہ ہے کہ قرآن خود کافی ہے کسی غیر اللہ کتاب کا محتاج نہیں۔ فلہذا زیرِ نظر ترجمہ اور تفسیر میں اس امر کی پوری کوشش کیگئی ہے کہ کسی بھی مقام پر کفائتِ قرآن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

۱۱۔ قرآن کریم کا مفسر خود خدا تعالیٰ ہے

اس ضمن میں نفی اثبات کے حصر کیساتھ مذکور ہے کہ خدا تعالیٰ نے اپنی کتاب کی تفسیر خود کر دی ہے۔ (یہ بحث پیچھے گذر چکی ہے لیکن قرآن فہمی کے قرآنی اصول کی فہرست میں، چونکہ اسکا ایک خاص مقام ہے۔ اسلئے دوبارہ لائی جارہی ہے معاف فرمائیگا)۔ دیکھئے ارشادِ باری ہے:۔
● وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ○ [۲۵/۳۳]
(مفہوم) اے رسول! لوگ آپکے پاس اس قرآن کی مثل نہیں لاسکینگے۔ بلکہ ہم ہی ہیں جو آپ کے پاس قرآن بھی لاتے ہیں۔ اور اسکی احسن تفسیر بھی لاتے ہیں۔

پس **قرآن فہمی کا گیارھواں اصول** یہ ہے کہ قرآن اپنا مفسر آپ ہے۔ فلہذا تفسیر زیرِ نظر میں قرآن کی تفسیر قرآن کریم ہی کیساتھ کی گئی ہے۔ اور اسی اساس پر اس تفسیر دلپذیر کا نام اسم بامسمّٰی تجویز کیا گیا ہے۔ **تفسیر القرآن بالقرآن**

۱۲۔ قرآن کریم میں تضاد و تخالف ہرگز نہیں ہے

کتاب مجید فرقانِ حمید کے متعلق خدا تعالیٰ کا ایک انتہائی زور دار دعویٰ یہ بھی ہے کہ اِس کتاب کے، خداوندی کتاب ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اِسکی آیات کریمات میں باہمی تضاد و تخالف ہرگز ہرگز موجود نہیں۔ بالفاظِ دیگر، اِس میں تضاد و تخالف ماننا، اِسے کتاب خداوندی ماننے کے انکار کے مترادف ہے۔ دیکھئے ارشادِ باری ہے :-

◎ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا ○ ۴/۸۲

(مفہوم) لوگ قرآن میں تدبر کیوں نہیں کرتے۔ (یعنی اِنہیں اِس میں غور کرنا چاہیئے۔ اور اِس اساس پر غور کرنا چاہیئے کہ اِس میں اختلاف ہرگز نہیں ہے، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے) حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو لوگ اِس میں معمولی نہیں، بلکہ) بہت زیادہ اختلاف موجود پاتے۔

پس قرآن فہمی کا بارھواں اصول یہ ہے کہ اِس میں اختلاف نہیں ہے۔

فلہٰذا زیرِ نظر ترجمہ اور تفسیر میں اِس قرآنی قدر کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے کہ قرآن کریم کی کوئی آئت کسی آئت سے ٹکرانے نہ پائے۔ جہاں کہیں دو آئتوں میں بظاہر تضاد و تخالف معلوم ہوتا ہے۔ وہاں خدا تعالیٰ کی ہدائت ذیل پر عمل کرتے ہوئے باہم متصادم دو آیات کریمات میں سے متشابہ آئت کو محکم آئت کے ماتحت رکھا گیا ہے۔ جیسے کہ خداوند تعالیٰ نے خود فیصلہ دیا ہے :-

۱۳۔ قرآن کریم میں آیات محکمات بھی ہیں۔ اور متشابہات بھی ہیں لیکن اصل کتاب محکمات ہیں

● ھُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْہُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِھٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗٓ اِلَّا اللّٰہُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ ۳/۷

(مفہوم) اے رسول! وہ اللہ ہی ہے جس نے آپکی طرف اپنی کتاب نازل فرمائی ہے۔ اِس میں آیات محکمات ہیں۔ وہ اصل کتاب ہیں اور دوسری قسم ہے متشابہات[1]، (بظاہر مختلف لیکن حقیقت میں محکمات سے ملتی جلتی اور عین اُنکی مثل و مانند ہیں) پھر جن لوگوں کے قلوب ٹیڑھے ہیں۔ وہ اُس (کتاب) میں متشابہات کے اُس (مفہوم) کی اتباع کرتے ہیں جس میں محکمات کے خلاف شبہ پیدا ہوتا ہو۔ ایسے لوگوں کی

---

[1] لفظ متشابہات، متشابہ کی جمع ہے جسکا معنیٰ ۶/۱۴۱ میں قرآن کریم نے خود بتا دیا ہے ملتا جلتا اور مثل و مانند۔ جیسے کہ ارشاد ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ پیدا کرتا ہے کھجوریں مختلف الاقسام کے اجناس زیتون اور انار مُتَشَابِھًا وَّغَیْرَ مُتَشَابِہٍ ۶/۱۴۱ یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور نہ ملتے جلتے پس جس طرح اِس آئت مجیدہ میں متشابھًا کا معنٰی ہے ملتے جلتے اور مثل و مانند اِسی طرح متشابہات کا معنیٰ بھی یہ ہے کہ وہ محکمات سے عین ملتی جلتی، اور مثل و مانند ہیں مخالف و متضاد ہرگز نہیں۔ اور اُنکی تاویل خود اللہ تعالیٰ نے محکمات میں کر دی ہے، جنکی وہ متشابہ یعنی مثل و مانند ہیں۔

غرض اُس میں فتنہ کی تلاش اور من مانی تاویل ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس (کتاب) کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور جو لوگ قرآنی علم کے پکے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم اس قرآن پر ایمان لائے ہیں محکمات و متشابہات سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ (وہ متشابہات کو محکمات کی مثل و مانند مانتے ہیں، متضاد و متخالف نہیں مانتے)

دیکھئے! اِس آئت سے ثابت ہے کہ متشابہات کی اتباع ٹیڑھے قلوب کی نشانی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ اگر کہیں قرآن کریم کی دو آیات کریمات کے مفہوم و معانی میں بظاہر تضاد و تخالف پایا جائے۔ تو اُسکے دُور کرنے کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے کہ ان میں سے کونسی محکم اور کونسی متشابہ ہے۔ تاکہ متشابہ آئت مجیدہ کو محکم آئت کریمہ کے ماتحت رکھ کر محکم کے مطابق مفہوم اخذ کیا جائے۔ یعنی متشابہات کو محکمات کی مثل و مانند مانا جائے، مخالف نہیں۔ اِس سلسلے کی چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں:-

۱۳/۱ کیا ہدائت و گمراہی انسان خود اختیار کرتا ہے یا اللہ ہی ہدائت دیتا، اور وہی گمراہ کرتا ہے

ہدائت و گمراہی کے متعلق قرآنی آیات کریمات میں اچھا خاصہ ٹکراؤ پایا جاتا ہے بعض آیات کے لفظی ترجمہ کی رُو سے یہ مفہوم برآمد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ہر کسی کو ہدائت دیتا ہے اور وہی گمراہ کرتا ہے۔ اور بعض آیات کے الفاظ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ہدائت پانا یا گمراہ ہو جانا انسان کا اپنا کام ہے۔ اور اس ٹکراؤ کو قرآنی ہدائت کے مطابق دُور نہ کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے ہاں صدیوں سے یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ:- ● ہدائت و گمراہی اللہ تعالیٰ کے قبضۂ قدرت میں ہے۔ جسے چاہتا ہے ہدائت عطا فرماتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے! اور جسے وہ گمراہ کر دے اُسے کوئی ہدائت دینے والا نہیں ہے۔ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۷/۱۸۶ ۔ اور یہی آئت مجیدہ جمعہ کے خطبوں میں پڑھکر سنائی جاتی ہے۔ حالانکہ بات بالکل سیدھی سی ہے۔ کہ اگر حقیقت یہی ہے کہ اللہ ہی جسے چاہتا ہے ہدائت دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے۔ تو ہدائت پانیوالے کی خوبی کیا ہوئی اور گمراہ ہونیوالے کا قصور کیا ٹھہرا؟ اور پھر جزا سزا کا کیا مطلب؟ اور خود گمراہ کردہ کو جہنم داخل کرنا کہاں کا انصاف ہے؟ اور کیا یہ زبان زد نظریہ، مکافاتِ عمل کی پوری عمارت کو منہدم نہیں کر دیتا؟ ذیل میں ہدائت و گمراہی سے متعلقہ آیات کریمات کا تقابل ملاحظہ فرمائیں۔ کہ بظاہر کس قدر تضاد و تخالف پایا جاتا ہے جس کا حل ۱۳/۳ میں دیدیا گیا ہے:-

۱۳/۲ - اللہ ہی ہدائت دیتا اور وہی گمراہ کرتا ہے	انسان خود ہدائت پاتا اور خود گمراہ ہوتا ہے
ا- ● مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۷/۱۷۸	ب- ● فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۳۹/۴۱
جسے اللہ ہدائت دے۔ وہی ہدائت پانیوالا ہے۔	جس نے خود ہدائت پائی، اُسکا فائدہ اُسکی اپنی جان کیلئے ہے
● مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۷/۱۸۶	● وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۳۹/۴۱
جسے اللہ گمراہ کر دے اُسے کوئی ہدائت دینے والا نہیں ہے	اور جو خود گمراہ ہو گیا۔ بلاشبہ اُسکا وبال اُسکی اپنی جان پر ہے۔

دیکھیگا !:-

اِن آیات کریمات میں بظاہر کتنا بڑا تضاد و تخالف موجود ہے۔ اور محکمات و متشابہات سے متعلقہ قرآنی ہدایات کو نظرانداز کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ عوام کے علاوہ بڑے بڑے جیّد علماء تک، برسرِ منبر کہہ دیتے ہیں کہ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اور مروجہ تراجم میں آیاتِ مجیدہ $\frac{۷}{۱۷۸ و ۱۸۶}$ کا معنی بالکل یہی لکھا ہے کہ جسے اللہ ہدایت دے وہی ہدایت پاتا ہے۔ اور جسے اللہ گمراہ کر دے اُسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ــــ لیکن $\frac{۳}{۷}$ کی خداوندی خبر کے مطابق کہ اُسکی مقدس کتاب میں آیات محکمات بھی ہیں۔ اور متشابہات بھی ہیں پس آیاتِ بالا میں سے یہ معلوم کرنا ضروری ٹھہرا کہ محکمات کونسی ہیں اور متشابہات کونسی ہیں: تاکہ متشابہات کا مفہوم محکمات کے مطابق لیکر اِس ظاہری تضاد کو ختم کیا جائے۔

اب غور فرمائیگا! کہ اگر آیات کریمات **ا** کو محکم مانا جائے، جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ اللہ ہی ہدایت دیتا، اور اللہ ہی گمراہ کرتا ہے تو قرآنِ کریم کا بتایا ہُوا مکافاتِ عمل یعنی جزا سزا کا پُورا انتظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ کھُلے بندوں ظالم و بے انصاف ٹھہرتا ہے کہ خود ہی گمراہ کرتا ہے اور خود ہی اپنی عطا کردہ گمراہی کی سزا دیتا ہے۔ نیز اُسکا اپنا فرمودہ ● اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ $\frac{۴۰}{۴۱}$ بیکار محض ثابت ہوتا ہے جس میں انسان کو صاحب اختیار و ارادہ ٹھہرایا گیا ہے کہ جو چاہو کرو۔ اچھے عمل بجا لاؤ تو خود، اور بُرے اعمال اختیار کرو تو خود ــــ جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے کفر کرے ؛ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ $\frac{۱۸}{۲۹}$ ــــ پس ثابت ہُوا کہ آیات مجیدات **ا** متشابہات ہیں۔ اور آیات کریمات **ب** محکم ہیں، جن میں بتا دیا گیا ہے کہ انسان خود ہی ہدایت پاتا اور خود ہی گمراہ ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نہ کسی کو زبردستی ہدایت دیتا ہے اور نہ کسی کو زبردستی گمراہ کرتا ہے ــــ اب آیئے تقابل کی آیات کریمات **ا** یعنی متشابہات کی طرف، کہ وہ کس طرح محکمات کے مثل و مانند ہو جاتی ہیں۔ اِنکا مفہوم پہلے تو خود اِن کے سیاق، اور پھر قواعدِ عرب کی روشنی میں ملاحظہ فرمائیں۔ یاد رہے کہ $\frac{۷}{۱۷۸}$ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ کے سیاقِ کلام، $\frac{۷}{۱۷۵}$ میں ارشاد ہُوا ہے :-

● وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ٥ = اے رسولؐ! انہیں اُس شخص کی خبر سنائیگا، جسے ہم نے اپنی آیتیں دیں (کہ وہ ہدایت پر آجائے) لیکن وہ اُن (آیتوں کی حدود) سے نکل گیا۔ پس اُس کے پیچھے (نفس) شیطان لگا۔ پھر وہ خود گمراہوں میں سے ہو گیا ــــ دیکھئے! یہاں گمراہی کا سبب اُسکا آیاتُ اللہ کی حدود سے خود نکل جانا بتایا گیا ہے۔ خدا تعالیٰ نے تو اُسے ہدایت دیدی تھی ــــ اب اِس سے آگے آتی ہے متشابہ آیت مجیدہ **ا**:-

● مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ $\frac{۷}{۱۷۸}$ ــــ اِس میں **مَنْ** متضمن بمعنی شرط ہے، شرط محذوف ہے۔ اور سیاقِ کلام کے مطابق: تقدیرِ کلام اور آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے :- ● مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَاِنْ قَامَ عَلَى الْهُدٰى فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ، جسے (اپنے نازل کردہ ضابطہ کے ذریعہ) اللہ ہدایت دے، پھر اگر وہ ہدایت پر قائم رہے (یعنی ہدایت کی حدوں سے انسلاخ

نہ کرے، باہر نہ نکلے) تو وہی ہدائت پانیوالا ہے۔ اب آئیے ۶/۱۸۶ کیطرف :۔

● مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ ــــ اِس میں یُضْلِلْ باب افعال سے ہے، جسکا ایک خاصہ وجدان یعنی پانا ہے نیز اِس میں بھی مَنْ متضمن معنی شرط ہے، شرط محذوف ہے۔ تقدیر کلام اور مفہوم یہ ہے :۔ ● مَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَاِنْ قَامَ عَلَی الضَّلَالَۃِ فَلَا ھَادِیَ لَہٗ = جسے اللہ گمراہ پائے یعنی جو ہدایت خداوندی سے اعراض کرتا ہو۔ پھر اگر وہ گمراہی پر خود اڑا رہے۔ تو اُسے کوئی ہدائت دینے والا نہیں ــــ نیز ۴/۱۱۵ میں آیا ہے :۔

● نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی = ہم اُسے اُسی طرف کو پھیرنے دیتے ہیں، جدھر کو وہ خود پھرتا ہے۔

۳/۱۲ متشابہات کی ایک اہم مثال

ہدائت وگمراہی ہی کے ضمن میں ۲۲/۱۶ میں ارشاد ہوا ہے :۔

● وَاَنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ ــــ قواعدِ عرب کی رُو سے اِس آئت کے یہ دونوں معنے درست ہیں :۔ لا۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ جس کیلئے خود ارادہ کرتا ہے اُسے ہدائت دیتا ہے۔

ب۔ اور بیشک اللہ اُسے ہدائت دیتا ہے۔ جو ہدائت پانے کا خود ارادہ کرتا ہے۔

تو اب ظاہر ہے کہ یہ آئت متشابہ ہے۔ اور ٹیڑھے ذہنوں والے لوگ اِسکی رُو سے ہدائت وگمراہی کو خدا تعالیٰ کے ذمّہ لگا کر انسان کے جملہ عیوب وجرائم کا ذمہ دار خود خدا تعالیٰ کو ٹھہرا دیتے ہیں۔ لیکن اس متشابہ آئت کے مقابلے میں، انہی الفاظ پر مشتمل محکم آئت مجیدہ ملاحظہ فرمائیں :۔

● یَھْدِیْٓ اِلَیْہِ مَنْ یُّنِیْبُ ۴۲/۱۳ ــــ واضح رہے کہ قواعد عرب کی رُو سے اِس آئت کا صرف اور صرف یہی ایک معنیٰ ہے کہ :۔ ● اللہ تعالیٰ صرف اُس کو ہدائت دیتا ہے، جو اُسکی طرف خود رجوع کرتا ہے۔ فلہذا ثابت ہوا کہ آئت مجیدہ ۴۲/۱۳ محکم ہے اور ۲۲/۱۶ متشابہ ہے یعنی اِس محکم کے عین مطابق ہونیوالی۔ اگرچہ قواعد عرب کی رُو سے اَنَّ اللّٰہَ یَھْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ کا معنیٰ ۴۲/۱۳ کے خلاف لیا جانا درست ہے کہ اللہ جس کے متعلق خود ارادہ کرتا ہے۔ اُسے ہدائت دیتا ہے لیکن ۳/۷ کی خداوندی ہدائت کے مطابق کہ اصل کتاب محکمات ہیں متشابہات نہیں۔ اِسلئے اِسکا معنیٰ ۴۲/۱۳ کی محکم آئت کے ماتحت رکھ کر یہ لیا جانا ضروری ہے کہ :۔

بیشک اللہ تعالیٰ اُسے ہدائت دیتا ہے جو ہدائت پانے کا خود ارادہ کرتا ہے ــــ فلہذا کسی بھی متشابہ آئت کا مفہوم کسی محکم آئت کے خلاف اخذ کرنا منشاء خداوندی ۳/۷ کے خلاف اور سَو فیصدی غلط ہے۔

ایک ضروری نوٹ

اُمّت کے متعدّد متنازعہ مسائل ایسے ہیں، جن کیلئے ہر فرقہ قرآن کریم ہی سے دلیل لاتا ہے۔ لیکن فریقین، جن قرآنی دلائل کیساتھ ایک ہی مسئلہ کو الگ الگ منفی اور مثبت دونوں صورتوں میں ثابت کر دکھاتے ہیں۔ اور سادہ لوح عوام دونوں طرف کے دلائل پر ششدر رہ جاتے ہیں کہ قرآنی دلائل ہی سے آنحضور سلام علیہ بشر بھی ہیں اور نور بھی ہیں۔ عالم الغیب بھی ہیں۔ اور پسِ دیوار کی چیز دن تک سے بے خبر بھی۔ وفات پا چکنے کے باوجود زندہ بھی ہیں،

اور مرکر مٹی میں مٹی بھی ہو چکے ہیں۔ اگر ان مسائل سے متعلقہ الگ الگ قرآنی دلائل میں محکمات و متشابہات کی تمیز کرلی جائے اور یقین قرآنی ہدایت کو پس پشت نہ ڈالتے ہوئے محکمات و متشابہات کے امتیاز کو لازم سمجھیں تو جملہ مسائل آنِ واحد میں حل ہو سکتے ہیں۔

۱۴۔ محکمات و متشابہات کی تعریف

محکمات کا لفظ مادہ ح۔ک۔م۔ حکم سے مشتق ہے۔ اسکا بنیادی معنی ہے منع کرنا، روکنا، قابو میں رکھنا۔ حکمہ کہتے ہیں لگام کو جس کیساتھ گھوڑے کو روکا اور قابو میں رکھا جاتا ہے۔ نیز روکنے اور قابو میں رکھنے ہی کو حکم کہتے ہیں۔ حاکم کا کام یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کے ہر فرد کو اُسکے فرائضِ منصبی کی حدود کے اندر روک رکھے۔ اور کسی فرد کو دُوسرے افراد کی حدود میں تصرّف نہ کرنے دے۔ ایسی چیز کو جو اپنی حدود میں محدود ہو یعنی اپنے مقام کو کبھی نہ چھوڑے، اُسے محکم کہا جاتا ہے۔ فلھذا آیاتِ محکمات کی ایک تعریف یہ ہے کہ اُن کے مفہوم و معانی میں لچک ہوتی ہی نہیں۔ اور وہ کبھی بھی اپنا مقام نہیں چھوڑتیں۔ اُنکے ایک سے زائد معنے لئے ہی نہیں جا سکتے۔

اسی مفہوم کو اس انداز سے بھی ذہن نشین کیا جا سکتا ہے۔ کہ قرآن کریم نے آیاتِ محکمات کو "ھُنَّ اُمُّ الْکِتٰبِ" بتایا ہے۔ اُمّ کا معنی ہے ماں، جڑ، اصل، بُنیاد۔ اب ظاہر ہے کہ جس طرح ہر متنفّس کی ماں بھی ایک، اور ہر عمارت کی بنیاد بھی صرف اور صرف ایک ہوتی ہے۔ اسی طرح آیاتِ محکمات وُہ ہیں جن کا معنیٰ اور مفہوم صرف ایک ہے جنہیں ایسے محکم الفاظ کی لگام (حکمہ) چڑھی ہوئی ہوتی ہے۔ جن کے معانی اور مفہوم میں تاویل کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اور ظاہر ہے کہ تاویل کی گنجائش صرف اور صرف اُسوقت پیدا ہوتی ہے جب الفاظ حقیقت کی بجائے مجاز، تشبیہہ، یا استعارہ کے طور پر لائے گئے ہوں۔ فلھذا:-

● محکم آیات مجیدہ وہ ہیں جن کے الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں آئے ہوں۔ اور وہاں مجاز، محاورہ، استعارہ اور تشبیہہ کا گزر تک نہ ہو۔

● اور متشابہ آیات وہ ہیں جن کے الفاظ حقیقی معنوں کے خلاف مجاز، محاورہ، استعارہ یا تشبیہہ کے طور پر استعمال ہوئے ہوں مثلاً عربی زبان میں اکل کہتے ہیں کھانے کو اور شرب کہتے ہیں پینے کو۔ اب کلیہ بالا کی رُو سے ظاہر ہے کہ جس آیت مجیدہ میں یہ مصادر حقیقی معنوں میں آئیں، وہ محکم ہوگی۔ اور جس میں مجازی معنوں میں استعمال ہوئے ہوں، وہ متشابہ ہوگی۔

● مصدر "شرب" بمعنی پینا کے مجازی مفہوم کی مثال پچھلے صفحات پر "اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ" ۲/۹۳ کے الفاظ میں گزر چکی ہے کہ بچھڑا چونکہ کوئی پینے کی چیز نہیں، فلھذا اس آیت میں اُشْرِبُوْا بطور مجاز استعمال ہُوا ہے۔ اور یہ آیت مجیدہ متشابہ ہے محکم نہیں۔

● مصدر "اکل" کے مجازی استعمال کی مثال آیت ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔ ارشادِ باری ہے:-

● اِنَّ الَّذِیْنَ یَاْکُلُوْنَ اَمْوَالَ الْیَتٰمٰی ظُلْمًا اِنَّمَا یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۴/۱۰ - بیشک جو لوگ یتیموں کا مال بے جا طور سے کھاتے ہیں۔ بلا شُبہ وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں۔

غور فرمائیگا! کہ اس آیت میں یَاْکُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا کے الفاظ مجازی معنوں میں آئے ہیں۔ کیونکہ آگ کھانے کی چیز نہیں۔ تو جس طرح ان متشابہ الفاظ سے اس قسم کا کوئی جیسا کہ مفہوم اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ کہ یتیموں کا مال، بیجا طور پر

کھانیوالوں کیلئے فی الحقیقت آگ بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس پر ہر قسم کی چیستانی حاشیہ آرائی بھی غلط ہے کہ کسی بھی زمانے میں معجزاتی طور پر یتیموں کا مال آگ بن گیا ہو ــــ یہ تو ہوئیں مصادر اکل اور شرب کے مجازی استعمال کی مثالیں، جو متشابہات کی نشانی ہیں۔ اب قرآن کریم کی ایک ہی آئت مجیدہ میں، ان دونوں مصدروں کے حقیقی معنوں کا استعمال ملاحظہ فرمائیں:۔

● كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ○ ۲/۶۰۔ اللہ کے رزق سے کھاؤ پیئو۔ اور زمین میں فساد نہ کرتے پھرنا۔ دیکھئے! اس آئت مجیدہ میں اکل و شراب کے مجازی معنے لئے ہی نہیں جا سکتے۔ بلکہ یہاں حقیقی معنے لئے بغیر کوئی چارہ کار ہے ہی نہیں۔ لہذا یہ محکم آئت مجیدہ ہے۔

المختصر! محکمات و متشابہات کی ایک قسم یہ ہے کہ جن آیات کریمات کے الفاظ حقیقی معنوں میں استعمال ہوتے ہوں۔ اور ان سے مجازی معنے لینا ممکن ہی نہ ہو وہ محکمات ہیں۔ اور جن کے الفاظ مجازی معنے دیتے ہوں۔ اور ان سے حقیقی معنے اخذ کرنا ناممکن ہو وہ متشابہات ہیں۔

۱۳/۵ - الفاظ کے حقیقی اور مجازی معنوں کی پہچان کا واحد ذریعہ مشاہدات عالم ہیں۔

اب رہا، حقیقی اور مجازی معنوں کی پہچان کا سوال! اسکا جواب مذکورہ بالا مثالوں میں بدرجہ اتم آچکا ہے جس طرح آگ کھانے کی چیز نہیں۔ يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۴/۱۰، اور سامری کا بچھڑا پینے کی چیز نہیں تھی۔ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ ۲/۹۳۔ اور یہ فیصلہ ہے مشاہدات عالم یعنی قوانین جاریہ کا۔ فلھذا اسی کلیہ کے مطابق، قرآن کریم کے ہر وہ الفاظ جن کے حقیقی معنے کارگاہ کائنات کے روز مرہ کے تجربات و مشاہدات کے کسی بھی گوشے کی مخالفت کرتے ہوں۔ وہ آئت مجیدہ متشابہ ہے۔ اور ان الفاظ کے وہ مجازی معنے لئے جانے صحیح ہیں جو عربی لغت اور کائناتی مشاہدات و تجربات کے مطابق ہوں۔

پس قرآن کریم کی کسی آئت سے عالمی مشاہدات کے خلاف کوئی چیستانی مفہوم اخذ کرنا، ۳/۷ کے اس خداوندی اعلان کی بغاوت پر مبنی ہے مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ۔ لہذا زیر نظر ترجمہ اور تفسیر میں مشاہدات عالم کے ہر گوشے کی مخالفت سے پورا پورا احتراز کیا گیا ہے۔ اور ہر مقام پر الفاظ کے حقیقی اور مجازی معنوں کا معیار مشاہدات عالم ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

● نیز قرآن مجید کا ایک اسلوب بیان یہ بھی ہے کہ عموماً اجمالی انداز بیان اختیار کرتا، اور تفصیلات کو محذوف رکھتا چلا جاتا ہے۔ اور دوسری آیات میں اس اجمال کی تفصیل دیدیتا ہے۔ ایسی اجمالی آیات کریمات بھی متشابہات ہیں۔ جن سے کائناتی قوانین کی خلاف ورزی کا تصور پیدا ہوتا، اور قرآن کریم میں چیستانیات کی گنجائش کے سوتے پھوٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ مثلاً آئت ذیل میں اجمالی انداز اختیار کیا گیا اور تفصیلات کو محذوف رکھا گیا ہے:۔

● وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۲/۲۲ = اور (اللہ تعالیٰ) آسمان سے پانی برساتا ہے۔

اس آیت سے یہ مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے کہ آسمان سے پانی بادلوں کے بغیر یعنی اس نظام کے سوا بھی برس سکتا ہے، جو بارشوں کیلئے اللہ تعالیٰ نے خود متعیّن کر دیا ہے، کہ جب تک سورج کی گرمی سے سمندروں، دریاؤں، جھیلوں اور جوہڑوں کا پانی بخارات بن کر، اور ہوا کے کندھوں پر سوار ہو کر آسمان میں نہ پہنچے، بارش نہیں ہوگی۔ اب چونکہ ۲/۲۲ میں مذکورہ نظام کی تمام کڑیاں محذوف رکھکر صرف اجمالی طور پر کہدیا ہے۔ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً۔ تو اس متشابہ آیت مجیدہ سے، کا سائنسی مشاہدات کی مخالفت کا جو شبہ پڑتا ہے اللہ تعالیٰ نے اُسے ذیل کی محکم آیت مجیدہ کیساتھ دُور کر کے آیت مجیدہ ۲/۲۲ اور اس عنوان کی تمام آیات کریمات کو جو قرآن بھر میں پھیلی ہوئی ہیں محکم کر دیا ہے۔

● وَاللّٰهُ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ الرِّیٰحَ فَتُثِیْرُ سَحَابًا فَسُقْنٰهُ اِلٰى بَلَدٍ مَّیِّتٍ فَاَحْیَیْنَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۳۵/۹ = (مفہوم) اور اللہ ہی وہ عظیم الشان ذات ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے۔ پھر وہ بادلوں کو (جو سورج کی تمازت کے پیدا کردہ بخارات ہیں) اُٹھاتی ہیں۔ پھر ہم اس (پانی) کو مُردہ زمین کی طرف لے آتے ہیں۔ پھر ہم اس کیساتھ مُردہ زمین کو زندہ کر دیتے ہیں۔ (اور ہر طرف سبزہ پھوٹ نکلتا ہے)

پس ہر وہ آیت جس کا اندازِ بیان اجمالی ہو، اور تفصیل محذوف کر دیگئی ہو۔ وہ متشابہ ہے۔ اور جس میں اُس محذوف گوشے کی تفصیل دیدی گئی ہو وہ محکم ہے۔

۱۳/۹ - نگاہِ بازگشت محکمات و متشابہات ایک نظر میں

۱۔ ہر وہ آیت مجیدہ محکم ہے جس کا گرامر اور لغتِ عرب کی رُو سے صرف ایک معنیٰ برآمد ہوتا ہو۔ اور ہر وہ آیت جس سے قواعد و لغت کے مطابق ایک سے زائد معنے لئے جا سکتے ہوں، متشابہ ہے۔ جیسے کہ صفحہ ۳۳ پر درج آیت اَنَّ اللّٰهَ یَهْدِیْ مَنْ یُّرِیْدُ ۲۲/۱۶ متشابہ ہے۔ اور یَهْدِیْۤ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ ۴۲/۱۳ محکم ہے۔

۲۔ ہر وہ آیت جس میں کوئی لفظ مجاز کے طور پر استعمال ہوا ہو وہ متشابہ ہے۔ اور جس میں اپنے حقیقی معنوں میں آیا ہو وہ محکم ہے۔ جیسے کہ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ ۲/۹۳ اور یَاْكُلُوْنَ فِیْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا ۴/۱۰ متشابہ ہیں۔ اور كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِی الْاَرْضِ مُفْسِدِیْنَ ○ ۲/۶۰ محکم ہے۔

۳۔ اور اسی طرح ہر وہ آیت جس میں کوئی لفظ تشبیہ، محاورہ یا استعارے کے طور پر استعمال ہوا ہو متشابہ ہے۔ جیسے كُلَّمَاۤ اَوْقَدُوْا نَارًا لِّلْحَرْبِ اَطْفَاَهَا اللّٰهُ ۵/۶۴ میں "لڑائی کی آگ" اور "اُسے اللہ بجھا دیتا ہے"۔ کے جملے محاورۃً تشبیہًا اور استعارۃً آئے ہیں حقیقت کیلئے نہیں آئے۔

۴۔ ہر وہ آیت جس سے مشاہداتِ عالم کے کسی بھی گوشے کی مخالفت کا مفہوم برآمد ہوتا ہو متشابہ ہے۔

۵۔ وہ اجمالی آیات مقدسات جن میں مسئلہ مذکور کی تفصیل محذوف و مقدر ہو وہ متشابہ ہیں۔ اور جن آیات میں اُس اجمال کی

تفصیل دیگئی ہو۔ وہ محکم ہیں۔ فلہذا اجمالی آیات متشابہات کو تفصیلی آیات محکمات کے ماتحت رکھنا ہوگا۔ جیسے کہ صفحہ ۳۶ پر مذکور آئت مجیدہ ۲/۲۲ متشابہ اور ۳۵/۹ محکم ہے۔

۱۴۔ خدا تعالیٰ نے آیات متشابہات نازل ہی کیوں فرمائی ہیں؟

محکمات و متشابہات سے متعلقہ اس آخری اور اہم سوال کا جواب آئت ذیل میں موجود ہے:- ● فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ○ ۵۱/۲۳۔ پس آسمان و زمین کے پروردگار کی شہادت ہے کہ بلاشبہ یہ قرآن حق ہے۔ یعنی مشاہداتِ عالم کے عین مطابق ہے۔ اور اسکا انداز بیان، بالکل وہی ہے جس طرح تم آپس میں روزمرّہ گفتگو کرتے ہو۔ فلہذا جس طرح روزمرّہ کی گفتگو میں حقیقت اور مجاز، استعارے اور تشبیہیں، محاورے اور ضرب المثلیں سب کچھ موجود ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم بھی اسی روزمرّہ کے طرزِ تکلّم سے لبریز و معمور ہے۔ فلہذا ۵۱/۲۳ کی رُو سے لازم آتا ہے کہ جس طرح ہم روزمرّہ کی مستعملہ اپنی متشابہات سے غلطی نہیں کھاتے حقیقت کو حقیقت، مجاز کو مجاز، تشبیہہ کو تشبیہہ اور استعارے کو استعارہ جانتے ہیں۔ اسی طرح قرآنی اندازِ حقیقت و مجاز، اور تشبیہ و استعارہ کو بھی اپنے اپنے مقام پر رکھیں۔ افسوس ہے کہ محکم و متشابہ کی تمیز کو نظرانداز کرکے یدُاللّٰہ اور وجہُ اللّٰہ کے قرآنی الفاظ سے اللہ تعالیٰ کو ہاتھ منہ والی شخصیت مانا جاتا۔ اور "خلق الانسان علیٰ صورتہٖ" تک کا تصور بھی دیا جاتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی صورت پر پیدا کیا تھا یعنی اللہ تعالیٰ بھی انسان جیسا منہ اور ہاتھ پیر رکھتا ہے۔ العیاذ باللہ!

۱۵۔ آیات متشابہات کو محکمات کر دیا گیا ہے

ارشاد باری ہے:- كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ○ ۱/۱۱۔ یہ ایک کتاب ہے جس کی آئتیں حکیم و خبیر کی طرف سے محکم کردی گئی ہیں۔ پھر اُسی کی طرف سے ان کی پوری پوری تفصیل بھی کردیگئی ہے ـــــ اس آئت کریمہ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو آیات کریمات ۷/۳ کی خبر کے مطابق متشابہات ہیں، خداوند حکیم و خبیر نے انہیں محکم کردیا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ آئتیں، جو پہلے ہی محکمات ہیں اُن کے محکم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا لیکن اس پر پھر سوال پڑتا ہے کہ متشابہات کو کس طرح محکمات کردیا گیا ہے۔ اس سوال کا جواب خود متشابہات اور محکمات کے قرآنی تقابل میں محفوظ و موجود ہے یعنی:-

۱۔ قواعد عرب کے مطابق جہاں کسی جملے کے ایک سے زائد مفہوم درست ثابت ہوتے ہوں۔ ایسی آیات متشابہات کو ایسی آیات محکمات لاکر محکم کردیا ہے، کہ قواعد کی رُو سے اُن کے ایک سے زائد معنے برآمد ہی نہیں ہوسکتے۔

۲۔ جہاں کوئی لفظ بطور مجاز استعمال ہوا ہے اُسکے مفہوم کو دوسرے مقام پر بطورِ حقیقت لاکر محکم کردیا ہے۔

۳۔ جہاں کوئی جملہ محاورہ، تشبیہہ یا استعارہ کے طور پر استعمال ہوا ہے اُسے بھی دوسری جگہ حقیقی معنوں میں بیان کرکے تشبیہہ و استعارہ کو حقیقت کی لگام (حکمہ) دیکر محکم کردیا ہے۔

۴۔ جو متشابہ آئت مشاہداتِ عالم کے کسی گوشے کی مخالفت کرتی ہے اُس پر اپنی کائنات کو حاکم ٹھہرا کر محکم کردیا ہے۔

۵۔ اور جس آئت میں اجمال ہے، اُس اجمال کو دُوسری آئت یا آیات میں تفصیلاً بیان کر کے محکم کر دیا ہے۔

محکمات و متشابہات کی بحث پر پھر ایک طائرانہ نگاہ دوڑائیں:۔

۹۔ سارا قرآن کریم باہم ملتا جلتا یعنی متشابہ ہے

● سابقہ صفحات میں آپ ۳/۷ کے حوالہ سے ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ قرآن کریم میں دو قسم کی آیات کریمات ہیں محکمات و متشابہات۔ اصل کتاب محکمات ہیں۔ فلہذا متشابہات کا وہ مفہوم صحیح ہے جو محکمات کے خلاف نہ جاتا ہو۔ ● اور ۳/۷ کے حوالہ سے آپ دیکھ چکے ہیں کہ متشابہات کو خود خدا تعالیٰ نے محکم کر دیا ہوا ہے۔ اور انہیں محکم کرنے کے پانچ مختلف طریقوں کی وضاحت بھی آپ کے سامنے آچکی ہے۔ اور اس پوری بحث کا ماحصل بھی نکھر کر سامنے آگیا ہے کہ آیات متشابہات سے اگرچہ آیات محکمات کی مخالفت کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ اور ٹیڑھے قلوب والے لوگ اس شبہ کو نمایاں کرنے میں لیکن فی الحقیقت یہ محکمات کے عین مطابق ہیں، متضاد و متخالف ہرگز نہیں۔ اسی چیز کا اعلان ذیل کے الفاظ میں اندازہ میں فرمایا گیا ہے:۔ ● اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۳۹/۲۳

(مفہوم) اللہ ہی وہ عظیم الشان ذات ہے جس نے ایک کتاب احسن الحدیث نازل فرمائی ہے۔ (جس میں تضاد و اختلاف قطعاً نہیں ہے ۴/۸۲) ساری کتاب متشابہ ہے۔ (یعنی آپس میں ملتی جلتی، باہم متماثل اور) بار بار دُہرائی ہوئی ہے۔

دیکھئے گا، کہ اس آئت پر معمولی سا غور و فکر کرنے سے بھی یہ بات نکھر کر سامنے آرہی ہے کہ ایک طرف، جہاں ۳/۷ میں کہا گیا ہے کہ پورا قرآن کریم مشتمل ہے آیات محکمات اور آیات متشابہات پر، تو دوسری طرف اس آئت ۳۹/۲۳ میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ سارے کا سارا باہم متشابہ اور متماثل ہے ــــ نیز ”متشابہا مثانی“ کے دو لفظوں نے اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ آیات کریمات کو بار بار دُہرانے، اور مختلف اندازِ تکلم سے بیان کرنے کی غرض، انہیں باہم متماثل ثابت کرنا ہے، جیسے کہ آپ سابقہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ اگر ایک آئت میں کوئی کلام محذوف ہے تو دوسری میں مذکور ہے۔ اگر ایک آئت میں کوئی لفظ مجاز یا استعارہ کے طور پر آیا ہے تو دوسری میں اسکی وضاحت کھلے لفظوں میں کر کے اشتباہ رفع کر دیا گیا ہے۔ اور یہی ہے قرآن کریم کا اسلوب بیان **تفسیر القرآن بالقرآن**۔

قرآن فہمی کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس میں محکمات بھی ہیں اور متشابہات بھی ہیں۔ اصل کتاب محکمات ہیں۔ رہا متشابہات جن سے محکمات کی مخالفت کا شبہ تو پیدا ہوتا ہے لیکن فی الحقیقت وہ محکمات کی مثل و مانند ہیں، انہیں محکمات کے ماتحت رکھنا، اور انکا مفہوم محکمات کے مطابق لیا جانا لازم ہے۔

۱۰۔ متشابہا مثانی کی تعریف ”سبعا من المثانی“ کے الفاظ میں

آئت بالا ۳۹/۲۳ میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ پوری کتاب مثانی (یعنی دُہرائی ہوئی) ہے۔ دوسرے مقام پر اسی چیز کو ذیل کے الفاظ میں بیان کیا ہے:

● وَلَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَالْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝ ۱۵/۸۷

(مفہوم) اے رسول! بیشک ہم نے آپکو سات دُہرائے ہوئے عنوانات یعنی نہایت بلند مرتبہ قرآن عطا فرمایا ہے (عطف واؤ تفسیری ہے)

۱۴۔ پورا قرآن کریم، سات دُہرائے ہوئے عنوانات میں

غور فرمائیےگا! کہ آیت بالا ۸۷/۱۵ میں قرآن فہمی کا ایک اور اصول بتایا گیا ہے کہ یہ عالی مرتبت کتاب سات دُہرائے ہوئے عنوانات پر مشتمل ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ کہ یا تو پوری کتاب کو سات حصّوں میں تقسیم کر کے، ہر حصّے کی ابتداء میں عنوان کی سُرخی دیدی گئی ہو۔ اور یا پھر کتاب کے شروع میں ایک ہی مقام پر ساتوں عنوانات بیان کر دیئے گئے ہوں۔ اب چونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ نہ قرآن کریم سات حصّوں میں منقسم ہے اور نہ ہر حصّے کی ابتداء میں الگ الگ سُرخیاں دی گئی ہیں۔ بلکہ اسکے شروع میں ایک ہی مقام پر سورہ فاتحہ میں سات عنوانات دیدیئے گئے ہیں۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ قرآن مجید کی پہلی سورۃ مجیدہ، جو سات عنوانات کی خبر دیتی ہے، ۸۷/۱۵ کے اعلان سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي کے مطابق، اس کتاب مقدّس کی فہرست اور پیش لفظ ہے، یہی وجہ ہے کہ اس سورت مجیدہ کا نام ہی سورہ فاتحہ ہے یعنی کتاب کا افتتاح کرنیوالی۔ فلھذا۔

قرآن فہمی کا چودھواں اصول خود قرآن کریم کی روشنی میں یہ ہے کہ پورا قرآن کریم سورہ فاتحہ کے سات اصولوں کے اجمال کی تفصیل ہے۔ فلھذا لازم آتا ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر و تفصیل اور تبیین و تشریح میں ذیل کے سات افتتاحی اصولوں کی مخالفت ہرگز نہیں کی جانی چاہیئے۔ جہاں کسی آیت مجیدہ کے حقیقی معنے فہرستِ قرآن کے کسی بھی اصول کی مخالفت کرتے ہوں، وہاں اُس کے وہ مجازی یا استعاراتی معنے لئے جانے چاہئیں جو سورۂ فاتحہ میں مذکور سات اصولوں میں سے کسی ایک کی بھی مخالفت نہ کرنے پائیں۔ اب سورہ فاتحہ کے ساتوں عنوانات، جن کی تفصیل و تفسیر پورا قرآن ہے، بیک نظر ملاحظہ فرمائیں۔ یاد رہے کہ خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی فہرست، سورہ فاتحہ میں قُل محذوف کیساتھ، خود رسول اکرم اور نوعِ انسانی کو متکلّم بنا کر، قرآن کریم کے قاری کی زبان سے ذیل کے سات دعوے لے رکھے ہیں۔ پس یہی وہ سات اجمالی عنوانات ہیں، جن کی تفصیل پورا قرآن کریم ہے۔

۱۵۔ قرآن کریم کا سات نکاتی منشور

تفسیر کی وہ سات نکاتی قرآنی منشور ہے۔ جو رسول اکرم نے عوام کے سامنے پیش کر کے قرآنی تحریک ربوبیت عامہ کی ابتدا فرمائی تھی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ اللہ صاحب بخشش عامہ اور رحمت خاصہ کے نام کیساتھ کہ تو ایسے صاحب قرآن!

۱-۲ ● اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ ۔ پوری حمد و ثنا جو کائنات کا گوشہ گوشہ بزبان حال ادا کر رہا ہے، اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ جو تمام جہانوں کی جملہ مخلوق کی روزی کے سامان مہیا کرنیوالا ہے۔ وہ اپنی پوری مخلوق پر عام بخشش اور مخصوص رحمت کرنیوالا ہے۔ (یعنی وہ بلا محنت اور با محنت دونوں انداز سے نعمتیں عطا کرنے والی ذاتِ مقدّس ہے)

۳- ● مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ = روزِ جزا کا واحد مالک ہے۔ (جو اس نے ربوبیت عامہ کے موافق اور مخالف اعمال کی باز پرس کیلئے خود مقرر کر رکھا ہے)

۴۔ ● إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝ ۔ (اے بلا محنت اور با محنت نعمتیں عطا کرنیوالے) ہم تیری ہی فرمانبرداری کرینگے۔ اور تجھ ہی سے مدد مانگتے رہینگے۔ (یعنی ہم اقرار کرتے ہیں کہ تیرے سوا نہ کوئی فرمانبرداری کے لائق ہے۔ اور نہ کوئی مدد کو پہنچ سکتا ہے۔ (لہذا ایسا نہیں ہوگا کہ ہم نماز تیری پڑھیں اور مرادیں غیر اللہ سے مانگیں۔ ہم ضرور عبادت واستعانت میں وصل کرینگے، فصل نہیں کرینگے)

۵۔ ● اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝ ۔ (پس ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہوئے دعا کرتے ہیں کہ) ہمیں سیدھے راستے پر چلائے رکھ (کہ تیرے قانون ربوبیت کو عملاً تسلیم کریں۔ جزا سزا کے دن کیلئے تیاری کریں۔ اور عبادت واستعانت میں وصل رکھیں فصل نہ کریں یعنی ایسا نہ ہو کہ نماز تیری پڑھیں اور مرادیں غیروں سے مانگتے رہیں۔

۶۔ ● صِرَاطَ الَّذِينَ أَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ ۔ (نیز ہم اقرار کرتے ہیں کہ تیری عطا کردہ یہی صراطِ مستقیم) اُن لوگوں کی راہ ہے جن پر تو نے انعام نبوت فرمایا تھا۔ (یعنی وہ بھی تیرے اس صراطِ مستقیم پر ایمان رکھنے، اور اسی پر عمل کرنیوالے تھے)

۷۔ ● غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّالِّينَ ۝ ۔ (ہم اقرار کرتے ہیں کہ تیرے انعام فرمودہ یعنی جملہ نبی رسول[۳۳] ایسی برگزیدہ جماعت تھی کہ) اُن پر کبھی تیرا غصہ نہیں ہوا تھا، کیونکہ وہ تیری راہ گم کرنیوالے تھے ہی نہیں۔

۱۴/۲ تحفظ ناموس رسالت غور فرمائیگا! کہ باری تعالیٰ نے اپنی کتاب کے شروع ہی میں اسکے قاری سے اپنے مقدس نام سے شروع کرنے کا حکم دیکر، ذیل کے سات اقرار لئے ہیں:۔

۱۔ ● بلا شراکت غیرے خالص حمد باری، اور پورے جہانوں کی پوری مخلوق کی ربوبیت عامہ کا عقیدہ۔

۲۔ ● خدا تعالیٰ کی بلا محنت اور با محنت عطا کردہ بے پایاں نعمتوں میں بلا تمیز پوری مخلوق کی ضروریاتِ زندگی کے مساویانہ حق پر ایمان لانا۔

۳۔ ● ربوبیت عامہ کی موافقت و مخالفت کی جزا سزا کیلئے قیامت کی عدالتِ عالیہ کے قیام کا یقین، اور اُس دن کے متعلق خدا تعالیٰ کی خالص ملکیت، یعنی اُس عدالت میں رشوت، سفارش اور فدیہ وغیرہ کی نفی کا عقیدہ۔

۴۔ ● خدا تعالیٰ کی خالص فرمانبرداری، اور اُسکی خالص استعانت میں وصل کا عقیدہ۔

۵۔ ● مذکورہ بالا عقائد ہی کا صراطِ مستقیم ہونا۔ اور اسی راہ پر ہمیشہ چلتے رہنے کیلئے حضور الٰہی میں دعا کرتے رہنا۔

۶-۷۔ ● جملہ رسل انبیاء کے متعلق ہمیشہ ہمیشہ کیلئے خدا تعالیٰ کے فرمانبردار رہنے، اور مغضوب و گم کردہ راہ نہ ہونے کا عقیدہ۔

فلہٰذا زیر نظر ترجمہ اور تفسیر میں مندرجہ بالا سات عنوانات کی، جو قرآن کریم کا دیباچہ ہیں۔ اور پورا قرآن جن کی تفصیل و تشریح ہے، پوری پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ جن الفاظ کے حقیقی معنے، ان میں سے کسی بھی اصول کے مخالف ہوں، انکے وہ مجازی معنے لئے گئے ہیں، جو سورہ فاتحہ کے ان سات اصولوں کی مطابقت کیساتھ ساتھ عربی قواعد و لغت کے بھی مطابق ہیں۔

۱۴/۳ - خدا تعالیٰ نے جن چیزوں کے وصل کا حکم دیا ہے اُن میں فصل کرنا موجب فساد ہے

سورۂ فاتحہ میں لئے گئے مذکورہ بالا وعدوں کی مخالفت کرنیوالوں کو فاسق اور مفسد قرار دیا گیا ہے:

● يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَّيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفٰسِقِينَ ۝ الَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ ۠ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَن يُّوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۭ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُونَ ۝ ۲/۲۶-۲۷ = گمراہ پاتا ہے[1] اللہ اسکے ساتھ بہت سے لوگوں کو اور ہدایت یافتہ پاتا ہے[2] اسکے ساتھ بہت سے لوگوں کو۔ اور نہیں گمراہ پاتا اسکے ساتھ مگر فاسقوں ہی کو گمراہ پاتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جو اللہ کیساتھ کئے گئے وعدوں کو توڑ دیتے، اور اللہ تعالیٰ نے جس چیز کے وصل کرنے کا حکم دیا ہے، اُسے منقطع کر دیتے ہیں اور اِس انفصال و انقطاع کے ذریعہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں۔ یہی لوگ خسارہ پانیوالے ہیں۔

نیز انہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے:- ● وَالَّذِينَ يَنقُضُونَ عَهْدَ اللّٰهِ مِن بَعْدِ مِيثَاقِهِ وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللّٰهُ بِهِ أَن يُّوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ ۙ أُولٰٓئِكَ لَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوٓءُ الدَّارِ ۝ ۱۳/۲۵، اور جو لوگ اللہ کیساتھ عہد کرنے کے بعد اُسے توڑ دیتے ہیں۔ اور اُن چیزوں کا باہم وصل نہیں کرتے، جن کے وصل کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ اور (اس طرح قرآن کریم سے غیر قرآنی عقائد و اعمال کا جواز ثابت کر کے) زمین میں فساد کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے اللہ کی لعنت ہے۔ اور اُن کیلئے بُرا ٹھکانہ ہے۔

دیکھئے! آیات بالا میں کافروں منکروں کا ذکر نہیں ہو رہا۔ بلکہ اُن کا ذکر ہے، جو اللہ تعالیٰ اور اُسکے ضابطے پر ایمان لا کر اُس سے عہد بھی کرتے ہیں لیکن عہد کی توثیق کے بعد اُسے توڑ دیا جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کیساتھ، سورہ فاتحہ کے الفاظ میں مذکورہ بالا سات وعدے تو بدستور جاری رہتے ہیں لیکن اُنہیں باندازِ ذیل توڑ کر فساد فی الارض کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں:-

۱- ● خدا تعالیٰ کی صفاتِ مخصوصہ میں، جو صرف اُسی کے لائق ہیں، انسانوں کو شامل کر کے حمد باری کو مجروح کیا جاتا ہے، اور خدا تعالیٰ کے قانون، ربوبیّت عامہ کا تصوّر تک گم کر کے، نوعِ انسانی کے ایک طبقہ کیلئے ضروریات زندگی کی محرومی، اور دوسرے کیلئے نعمتوں کی فراوانی کو خدا تعالیٰ کی طرف منسوب، اُن کی الگ الگ نام نہاد تقدیر بنا کر، کمزوروں پر طاقتوروں کے ظلم کا جواز مہیا کیا جاتا ہے۔

۲- ● خدا تعالیٰ کی بلا محنت، اور با محنت حاصل کردہ نعمتوں پر انسانی تصرّف کو صحیح، درست اور جائز قرار دیکر فساد

---

[1][2] یُضِلُّ اور یَہْدِیْ میں یُضِلُّ فعل مزید فیہ باب اِفعال سے ہے جس کا خاصہ وجدان ہے۔ اسلئے معنی لکھا گیا ہے اللہ گمراہ پاتا ہے لیکن یَہْدِیْ فعل ثلاثی مجرد ہے جس کا خاصہ وجدان اہلِ قواعد نے تسلیم نہیں کیا۔ ہم نے یہاں بھی خاصہ وجدان کی رُو سے معنی لکھا ہے کہ اللہ ہدایت یافتہ پاتا ہے۔ ثلاثی مجرد کے خاصہ وجدان کی بحث آگے آ رہی ہے۔

فی الارض کے سامان مہیا کئے جاتے ہیں یعنی تصور دیا جاتا ہے کہ نعماءِ خداوندی پر متصرّف افراد جس طرح چاہیں ضروریاتِ زندگی کی ناہموار تقسیم کرتے چلے جائیں۔

۳۔ ● ربوبیّت عامہ کے خداوندی توازن کو عملاً ختم کرکے روزِ جزا (یوم الدّین) کا عملی انکار کیا جاتا ہے۔ اگرچہ زبان سے مسلسل اقرار کیا جا رہا ہو۔

۴۔ ● خدا تعالیٰ نے جن چیزوں کو باہم ملانے یعنی متوصّل کرنے کا حکم دیا ہے انہیں ملانے کی بجائے جدا کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً:-

ا۔ سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کیساتھ عہد تو کیا جاتا ہے کہ تیری عبادت اور استعانت کو صرف تیرے لئے مخصوص رکھتے ہوئے، اِن کا اتّصال قائم رکھیںگے لیکن یہ پکّا عہد، جو اِیَّاکَ کی ضمیر مقدّم کے حصر کیساتھ دو مرتبہ کے تکرار اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ [۱] کے الفاظ میں بار بار کیا جاتا ہے، اُسے اِس طرح توڑا جاتا، اور عبادت و استعانت کے اتصال کو اس طرح منقطع کیا جاتا ہے کہ نماز پڑھی جاتی ہے اللہ کی۔ اور مُرادیں مانگی جاتی ہیں غیر اللہ سے۔

ب۔ نیز خدا تعالیٰ نے محکمات و متشابہات کے باہم وصل کرنے کا حکم دیا ہے [۲] لیکن محکمات و متشابہات کے تصوّر تک کو گم کرکے، متشابہات کو محکمات سے جدا کرتے ہوئے من مانی تاویلوں کیساتھ ابتغاءِ فتنہ اور فساد فی الارض کیا جاتا ہے۔

ج۔ قرآن کریم کے مختلف عنوانات کو فہرستِ قرآن کیساتھ متوصّل کرنا ضروری نہیں مانا جاتا۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے اُنکے وصل کا حکم دیا ہے۔ وَلَقَدۡ اٰتَیۡنٰکَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِیۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِیۡمَ ۝ [۱۵/۸۷]

۵۔ ● دُعا مانگی جاتی ہے، مندرجہ بالا متوازن نظامِ ربوبیّت والے صراطِ مستقیم کی لیکن غیر متوازن تقدیروں کے عقیدہ کے ذریعہ اِسکی شبانہ روز عملاً مخالفت کی جاتی ہے۔

۶-۷ ● خدا تعالیٰ نے اپنے جملہ نبی رسولوں کی سو فیصدی عصمت کا وعدہ لیا ہے لیکن اُن کی طرف جھوٹ، چوری اور دھوکا فریب وغیرہ تک منسوب کرکے اِس عہد کی خلاف ورزی کی جاتی ہے۔ حضرت یوسفؑ پر بھائی کو چور بنانے کا الزام، حضرت ابراہیمؑ پر تین مرتبہ جھوٹ بولنے کا بہتان، اور حضرتِ داؤدؑ پر دھوکے سے پرائی عورت حاصل کرنے کا افتراء باندھکر عہدِ خداوندی کو توڑا جاتا، اور انبیاء سلام علیہم کو صراطِ مستقیم سے ہٹا ہوا ثابت کیا جاتا ہے۔ نیز خدا تعالیٰ نے وعدہ لیا ہے کہ جملہ نبی رسولوں پر اُسکا کبھی غصّہ نہیں ہوا تھا۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ اِس مقدّس جماعت پر اللہ کے غصّے کا ثبوت مہیا کرتے ہوئے، کسی نبی کو آرے سے چروایا جاتا ہے، کسی کے بدن میں کیڑے ڈلوائے جاتے اور کسی کی حکومت چھنوا کر اُس سے مچھیروں کی نوکری کروائی جاتی ہے۔ کسی کو

---

[۱] اہلِ روایات کے ہاں بھی سورہ فاتحہ کو قرآن کریم کی فہرست تو تسلیم کیا گیا ہے لیکن قرآن اور اُسکے دیباچہ کو باہم متوصّل نہیں کیا جاتا جالانکہ ارشادِ باری ہے:- وَلَقَدۡ وَصَّلۡنَا لَهُمُ الۡقَوۡلَ لَعَلَّهُمۡ یَتَذَکَّرُوۡنَ ۝ [۲۸/۵۱]، اور بالتحقیق ہمنے اپنے قول کو باہم متوصّل کر دیا۔ تاکہ لوگ اِس سے نصیحت حاصل کریں۔

پہلے جنّت میں داخل کیا جاتا، اور پھر اُس سے نکلوا کر زمین پر پھینکا جاتا ہے۔ اور کسی پر خدا تعالیٰ کی ناراضگی کے ثبوت میں، اُس پر کئی کئی دن تک نزولِ وحی کا سلسلہ بند ہو جانے کی خبر دی جاتی ہے۔ العیاذ باللہ!

۱۴۔ تصویر کا دوسرا رُخ یہ تو ہُوا ۲/۲ اور ۱۳/۲۵ کی قرآنی خبر کے مطابق، سورہ فاتحہ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کیساتھ کیئے گئے عہد کو توڑنیوالوں اور اُن چیزوں کو ایک دوسری سے جُدا کرنیوالوں کا ذکر، جن کے ملانے کا حکم دیا گیا ہے۔ اب قرآنی الفاظ میں اُن لوگوں کی تعریف ملاحظہ فرمائیں، جو نہ اللہ تعالیٰ سے کیئے گئے عہد کو توڑتے ہیں، اور نہ اُن چیزوں (یعنی عبادت واستعانت ۱/۴، محکمات ومتشابہات ۳/۷، اور سورہ فاتحہ اور باقی قرآن ۱۵/۸۷) کو ایک دوسری سے جُدا کرتے ہیں۔ جن کے ملانے کا اللہ تعالیٰ نے حکم دے رکھا ہے۔

● اَفَمَنْ يَّعْلَمُ اَنَّمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ كَمَنْ هُوَ اَعْمٰى ۭ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَلَا يَنْقُضُوْنَ الْمِيْثَاقَ ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْۗءَ الْحِسَابِ ۝ ۱۳/۱۹-۲۱ = اے رسول! وہ شخص، جو جانتا ہے کہ جو کچھ تیری طرف تیرے رب کی جانب سے نازل ہُوا ہے، حق ہے۔ کیا وہ اُس شخص جیسا ہو سکتا ہے جو اِس حقیقت سے اندھا ہے۔ بلاشبہ عقلمند ہی اِس سے نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ کیساتھ کیئے ہُوئے عہد کو پورا کرتے ہیں۔ اور آپس کے ساتھ کیئے ہُوئے وثق عہد کو توڑتے نہیں اور اُس چیز کو باہم ملاتے ہیں، جس کے وصل کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی مخالفت اور بُرے حساب سے ڈرتے ہیں۔

فلہٰذا زیرِ نظر ترجمہ اور تفسیر میں آیاتِ بالا کے مطابق، نہ سُورہ فاتحہ کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ کیساتھ کیئے گئے عہد کو توڑا گیا ہے۔ اور نہ اُن چیزوں کا فصل کیا گیا ہے، جن کے وصل کا خدا تعالیٰ نے ۱/۴، ۳/۷ اور ۱۵/۸۷ میں حکم دے رکھا ہے۔

۱۵۔ قرآن کریم کی نہ کوئی آیت ہی منسوخ ہے نہ کسی آیت کا کوئی حصہ قرآن فہمی کے ایک اور اصول کی خبر آیت ذیل میں ملاحظہ فرمائیں:-

● لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۱۰/۶۴ = اللہ تعالیٰ کے کلمات کیلئے بدلنا ہے ہی نہیں۔ اگرچہ اِس آیت بعیدہ میں باندازِ بلیغ اعلان کر دیا گیا ہے کہ آیاتِ قرآنی میں تغیر و تبدّل ہرگز ہرگز ممکن نہیں۔ لیکن آیت ذیل میں اِس گمان کو بھی باطل قرار دیدیا گیا ہے۔ جو عوام کے ہاں یہ نظریہ چل رہا ہے۔ کہ خدا تعالیٰ خود تو اپنے کلام میں ردّ و بدل کا مجاز ہے۔ چنانچہ اعلانِ عام کر دیا گیا ہے کہ ہمارا قول خود ہماری طرف سے بھی ہرگز ہرگز تبدیل نہیں کیا جاتا۔ اِسے تبدیل کرنا تو بندوں بیچاروں پر ظلم عظیم ہے:-

مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝ ۵۰/۲۹ میرے ہاں قول بدلا ہی نہیں جاتا۔ اور نہ میں (اپنے قول کو بدل کر) اپنے بندوں پر ظلم کرنیوالا ہوں۔ اگرچہ عام تفاسیر و تراجم میں ناسخ و منسوخ کا تصوّر آج تک قائم ہے۔ لیکن زیرِ نظر ترجمہ اور تفسیر میں آیاتِ قرآنی کیلئے منسوخ ہو جانے کے تصوّر کو آیاتِ بالا کے انتہائی ٹھوس دلائل کے مطابق قریب تک پھٹکنے

نہیں دیا گیا۔ سورہ بقرہ کی آیت مجیدہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَةٍ ...... الخ جس سے تنسیخ آیات کا جواز لیا جاتا ہے، کی وضاحت ناسخ و منسوخ کے الگ عنوان میں آگے آرہی ہے۔

پس قرآن فہمی کا پندرھواں اصول یہ ہے کہ کلماتِ خداوندی کو نہ خدا تعالیٰ خود ہی تبدیل کرتا ہے۔ اور نہ کوئی غیر ہی تبدیل کر سکتا ہے۔

(نوٹ) اِس اصول کی وضاحت سولہویں اصول میں بھی ملاحظہ فرمائیں۔

۱۶۔ قرآن کریم کی حفاظت خود خدا تعالیٰ کے ذمہ ہے

قرآن فہمی کے ایک اور اصول کی خبر آیت ذیل میں دی گئی ہے:۔

● اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ ۱۵/۹ = بیشک الذکر قرآن کریم کو ہم ہی نے نازل کیا ہے اور ہم ہی اِسکے نگہبان ہیں ــــ اِسکے برعکس تجرید بخاری کے صفحہ ۱۱۲ پر حضرت عمرؓ کی روایت سے منقول ہے کہ "قرآن کریم میں آیتِ رجم نازل ہوئی تھی لیکن اب اِس میں موجود نہیں۔ (نعوذ) ــ یہ روایت سالمیتِ قرآن کو مجروح کرنے کیساتھ ساتھ حفاظتِ خداوندی کا مذاق بھی اُڑاتی ہے کہ خدا تعالیٰ نے حفاظتِ قرآن کا دعویٰ تو کیا تھا لیکن نباہ نہیں سکا۔ کوئی زبردست ہاتھ قرآن کریم سے آیتِ رجم نکال کر لے ہی گیا۔ آیتِ بالا کی رُو سے آیتِ رجم کے نزول و خروج کا نظریہ مطلقاً غلط ہے۔ اگر کوئی آیتِ رجم نازل ہوئی ہوتی تو یقیناً یقیناً قرآن کے اندر موجود ہوتی۔ اور جب موجود نہیں ہے تو ثابت ہوا کہ نازل ہی نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ قرآن کریم بحفاظتِ خداوندی محفوظ ہے۔ اِسی چیز کی تائید آیتِ ذیل سے ہوتی ہے:۔ ● وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ○ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ○ ۴۱/۴۱-۴۲ ــــ اور وُہ قرآن ایک غالب کتاب ہے۔ اُس میں باطل، نہ آگے کی طرف سے آسکتا ہے، نہ پیچھے کی طرف سے۔ اِسکا نازل ہونا صاحبِ حکمت و حمد کی طرف سے ہے ــــ افسوس روایات قرآن کریم کے اِس دعوے کی بھی تکذیب کرتی ہیں۔ جیسے کہ علامہ سیوطی کی اتقان میں بتایا گیا ہے کہ معوذتین، یعنی قرآن کریم کی آخری دو سورتیں، الفلق اور الناس نزولی نہیں، بلکہ الحاقی ہیں۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

آیاتِ بالا ۱۵/۹ + ۴۱/۴۱-۴۲ کی رُو سے قرآن فہمی کا سولھواں اصول یہ ہے کہ اِس میں نہ کوئی کمی ہوئی ہے نہ زیادتی۔ پس زیرِ نظر ترجمہ اور تفسیر میں ایسے کسی تصور کو راہ نہیں دی گئی، جو کتبِ روایات نے قرآن کریم میں سے کسی آیت یا سورت کے گم ہو جانے، یا کسی غیر تنزیلی آیت یا سورت کے اضافے کا دیا ہوا ہے۔

۱۷۔ اللہ تعالیٰ کی سنّت یعنی اُسکے کائناتی قوانین ہرگز نہیں بدلتے

قرآن فہمی کا ایک اور اصول آیتِ ذیل میں مذکور ہے:۔

● فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحْوِيْلًا ○ ۳۵/۴۳ = اے رسُول! اور اے قرآن کریم کے مخاطب! تو اللہ تعالیٰ کی سنّت میں ہرگز ہرگز تبدیلی نہیں پائیگا ــــ سنّت کا مطلق معنی ہے طریقہ، قاعدہ، دستور۔ اور اللہ تعالیٰ کا طریقہ

قاعدہ، اُسکا قانون جاریہ ہے، جو مشاہداتِ عالم کی صورت میں شبانہ روز جاری و ساری ہے۔ نیز اُسکے عالمی قوانین میں مشاہدہ کی رُو سے کبھی بھی تبدیلی نہیں پائی گئی۔ قوانینِ کائنات کے اِسی استقلال کی خبر آیتِ بالا ۳۵/۴۳ میں دیگئی ہے ـــ پس اِس آیتِ مجیدہ کے مطابق قرآن کریم سے کوئی ایسا مفہوم برآمد کرنا ہرگز ہرگز صحیح نہیں، جس میں خدا تعالیٰ کے قوانینِ کائنات کی مخالفت پائی جاتی ہو۔

پس قرآن فہمی کا سترھواں اصول یہ ہے کہ آیاتِ قرآنیہ میں قوانینِ کائنات کی مخالفت ہرگز موجود نہیں۔

فلہٰذا زیرِ نظر ترجمہ و تفسیر میں خدا تعالیٰ کے کائناتی قوانین کی مخالفت سے پوری پوری پرہیز کیگئی ہے۔ اور قرآن کریم کے جن مقامات پر سابقہ تفاسیر نے کائناتی قوانین یعنی سُنّت اللہ کی مخالفت کی ہے۔ اُس اجمال کی تفصیل، یا اُس مجاز کی حقیقت کو قرآن حکیم کے دوسرے مقامات سے پیش کر کے سُنّت اللہ کی مطابقت کو ہمیشہ قائم رکھا گیا ہے۔

۱۸۔ قرآن کریم ایک با ربط کتاب ہے پراگندہ و بے ربط ہرگز ہرگز نہیں

دُنیا بھر کی کتابوں میں سے کسی بھی کتاب کیلئے سب سے بڑا عیب یہ ہوتا ہے کہ اُسکے مندرجات میں نظم و ربط موجود نہ ہو۔ یعنی کوئی بات کہیں کی ہو کوئی کہیں کی۔ بات ہو رہی ہو امن کی، اور اُس میں آ گھسے جنگ کا قصّہ ذکر ہو اقتصادیات کا اور اُس میں آ دھمکے طبعی جغرافیہ۔ ذکر ہو مسائل طلاق کا اور اُس میں حکم دیا جا رہا ہو نماز کا ـــ سابقہ تراجم و تفاسیر نے باستثنٰے بعض، قرآن کریم کے نظم و ربط کو مطلقاً ضائع کر کے، اقوامِ عالم کیلئے کتاب خداوندی پر اعتراضات کے دروازے کھول دیئے ہوئے ہیں۔ حالانکہ اس ضمن میں خدا تعالیٰ نے اعلان کر رکھا ہے کہ اُسکا قول قرآن حکیم باہم مربوط و متوصّل ہے۔ پراگندہ اور منتشر نہیں:-

● وَلَقَدْ وَصَّلْنَا لَهُمُ الْقَوْلَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ○ ۲۸/۵۱ = اور بالتحقیق ہم نے اپنے قول (قرآن) کو باہم متوصّل کر دیا ہے تاکہ لوگ اِس سے نصیحت حاصل کریں ـــ دیکھئے! اِس آیتِ مجیدہ میں اِس امر کا اعلان کر دیا گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے قول قرآن کریم کے اندر باہمی وصل و ربط ہے فصل و انتشار نہیں۔ اور ساتھ ہی اِس چیز کی بھی خبر دیدی گئی ہے کہ نصیحت اُس کتاب سے حاصل کی جا سکتی ہے، جس میں ربط و وصل ہو۔ چونکہ یہ ایک مسلّم امر ہے کہ جب بے ربط کلام سے کچھ پلّے ہی نہیں پڑتا تو اُس سے نصیحت حاصل کرنے کا تصوّر کس طرح پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن ارشادِ باری کے مطابق قرآن حکیم ایک نصیحت نامہ ہے:-

● اِنَّ هٰذِهٖ تَذْكِرَةٌ ۷۳/۱۹ + ۷۶/۲۹، اِس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے مقدّس قول اور جلیل المرتبت نصیحت نامے، قرآن مجید کو داخلی طور پر باہم مربوط و متوصّل کر دیا ہے تاکہ لوگ نصیحت حاصل کر سکیں۔

پس قرآن فہمی کا اٹھارھواں اصول یہ ہے کہ اِسکی سورت سورت اور آیت آیت باہم منظوم و مربوط ہے۔

فلہٰذا ترجمہ و تفسیر زیرِ نظر میں اُن تمام آیاتِ مجیدات کا باہمی ربط قائم رکھا گیا ہے، جنہیں مروّجہ تراجم و تفاسیر نے بے ربط کر کے رکھ دیا ہوا ہے۔ نیز قیامِ ربط کیلئے صرف آیاتِ قرآنیہ اور مشاہداتِ عالم ہی کا سہارا لیا گیا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ کے قول و فعل کی

ہم آہنگی ہی کو آیاتِ کریمات کے باہمی ربط و وصل پر بطورِ دلیل لایا گیا ہے۔

۱۹۔ قرآنی محذوفات

نیز ربطِ آیات کیلئے اُن قرآنی محذوفات کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے جو ہر زبان میں عموماً اور عربی ادب میں خصوصاً پائے جاتے ہیں۔ مثلاً سورہ یوسف میں، جو بلا اختلاف ایک ہی قصے پر مشتمل، ایک مربوط سورت مجیدہ ہے، محذوفات کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً حضرتِ یوسف کے بھائی جب دوسری مرتبہ غلّہ لیکر مصر سے روانہ ہونے لگتے ہیں۔ تو چھوٹے بھائی کی بوری سے چوری کا پیالہ برآمد ہوتا، اور اُسے حراست میں لے لیا جاتا ہے اس پر باقی بھائی کوشش کرتے ہیں کہ اُسکی جگہ کسی اور بھائی کو رکھ لیا جائے لیکن اُن کی یہ خواہش پوری نہیں ہوتی۔ تو پھر وہ الگ بیٹھ جاتے ہیں۔ سب سے بڑا کہتا ہے کہ میں تو واپس نہیں جاؤنگا۔ کیونکہ والد بزرگوار نے مجھ سے پکّا عہد لیا ہوا ہے کہ یوسف کے حقیقی بھائی کو واپس آپکے پاس لیکر آؤنگا۔ لہٰذا تم سب جاؤ اور والد سے کہو کہ آپکے بیٹے نے چوری کی ہے۔ آپ اُس بستی والوں سے جس میں ہم تھے۔ اور اُس قافلے والوں سے جس کیساتھ ہم آئے ہیں، پوچھ کر تصدیق کرلیں۔ کہ واقعی آپکے بیٹے نے چوری کی ہے۔ اسلئے وہ حراست میں لے لیا گیا ہے۔ اور ہم اُسے واپس نہیں لاسکے۔

یہ ہیں بڑے بھائی کے الفاظ، جو اُس نے والد کو کہنے کیلئے اپنے بھائیوں سے کہے۔ اب ربطِ کلام کی رُو سے چاہئیے تھا، کہ اس سے آگے یہ درج ہوتا کہ۔ "بڑے بھائی سے مذکورہ ہدایات لیکر باقی بھائی قافلے کیساتھ وطن کی طرف روانہ ہوگئے۔ اور جب منزل بمنزل چلتے ہوئے اپنی بستی میں پہنچے۔ اور والد بزرگوار نے پوچھا کہ چھوٹے بھائی کو کیوں نہیں لائے۔ تو اُنہوں نے جواب دیا، ابّا جان آپکے چھوٹے بیٹے نے چوری کی ہے۔ اِسلئے پکڑ لیا گیا ہے۔ اِسکی تصدیق آپ اُس بستی والوں سے جس میں ہم تھے۔ اور اُس قافلہ والوں سے جس کیساتھ ہم آئے ہیں، کرلیں" ——— لیکن قرآن کریم میں یہ الفاظ، جو ہم نے الٹے واوٗں کے درمیان لکھے ہیں، موجود نہیں۔ بلکہ اِس پورے کلام کو حذف کردیا گیا ہے۔ اور بڑے بھائی کے اُس کلام کے عین بعد جو مصر میں ہورہی تھی، والدِ محترم کا جواب درج ہے۔ جو آپنے بیٹوں کے سفر طے کرکے آپکے پاس پہنچنے۔ اور اُن سے چوری کا قصّہ سُننے کے بعد اپنی بستی میں ارشاد فرمایا تھا۔ دیکھیئے قرآنی الفاظ۔ بڑا بھائی چھوٹے بھائیوں سے کہتا ہے:۔

• اِرْجِعُوْٓا اِلٰٓى اَبِيْكُمْ فَقُوْلُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّ ابْنَكَ سَرَقَ ۚ وَمَا شَهِدْنَآ اِلَّا بِمَا عَلِمْنَا وَمَا كُنَّا لِلْغَيْبِ حٰفِظِيْنَ ○ وَسْـَٔلِ الْقَرْيَةَ الَّتِيْ كُنَّا فِيْهَا وَالْعِيْرَ الَّتِيْٓ اَقْبَلْنَا فِيْهَا ۭ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ○ $\frac{12}{81-82}$

اور بڑے بھائی کے اِس کلام کے عین بعد جو سرزمین مصر میں ہورہی تھی، حضرتِ یعقوبؑ کا جواب درج ہے جو بیٹوں کے ایک طویل سفر کے بعد سرزمین وطن میں دیا گیا:۔

• قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ○ $\frac{12}{83}$ = باپ نے کہا یہ بات تمہارے نفسوں ہی کی تراشیدہ ہے پس میں تو صبر جمیل ہی سے کام لونگا ——— اب:۔

بنظرِ تعمق غور فرمائیگا! کہ اِنَّا لَصٰدِقُوْنَ کے الفاظ پر بڑے بھائی کا کلام ختم ہوا ہے۔ اور قَالَ بَلْ سَوَّلَتْ کے

الفاظ سے حضرت یعقوبؑ کا کلام شروع ہو گیا ہے۔ درمیانی پورا واقعہ یعنی بھائیوں کا روانہ ہونا۔ وطن پہنچنا۔ والد بزرگوار کی خدمت میں آ کر بڑے بھائی کے ہدایت کردہ الفاظ پیش کرنا وغیرہ سب کچھ محذوف ہے۔

پس قرآن فہمی کا اُنیسواں اصُول یہ ہے کہ قرآن کریم میں محذوفات کا اسلوب موجود ہے جس سے فائدہ اٹھانا لازم ہے۔

فلہٰذا زیر نظر ترجمہ و تفسیر میں، ربط کلام کیلئے قرآنی محذوفات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور اس چیز کو ہرگز ہرگز نظر انداز نہیں کیا گیا کہ اپنی کتاب لاریب کے متعلق خود خدا تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے کہ اس میں کسی قسم کی کجی اور ٹیڑھا پن موجود نہیں ہے:۔

● اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِهِ الۡكِتٰبَ وَلَمۡ يَجۡعَلۡ لَّهٗ عِوَجًا ۝ ۱۸/۱۔ پوری کی پوری حمد و ستائش اللہ تعالیٰ کیلئے ہے، جس نے اپنے بندے پر ایک کتاب نازل فرمائی جس میں، اس نے کسی قسم کی کجی اور ٹیڑھا پن ہرگز ہرگز نہیں رکھا۔

۲۰۔ **ذومعنی الفاظ کا مفہوم، ان کے متعدد معنوں میں سے وہ لیا جائیگا۔ جو ربطِ کلام، اور عربی لغت و قواعد کے بھی مطابق ہو! ورنہ کوئی بالا کسی قرآنی اصول کے خلاف نہ جاتا ہو۔**

ہر زبان میں بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں، کہ اہل زبان کے ہاں ان کے کئی کئی مفہوم چل رہے ہوتے ہیں۔ مثلاً عربی زبان میں ضَرَبَ کا لفظ ہے۔ اسکے پانچ معنے خود قرآن کریم میں مذکور ہیں:۔

۱۔ مارنا ۲۔ چلنا ۳۔ کاٹنا ۴۔ اوڑھنا ۵۔ بیان کرنا

۱۔ **مارنا**:۔ جو عورتیں زیور پہن کر باہر نکلیں انہیں حکم ہے کہ وہ زمین پر زور سے پیر نہ ماریں، تاکہ ان کی پوشیدہ زینت ظاہر نہ ہو:۔ ● وَلَا يَضۡرِبۡنَ بِاَرۡجُلِهِنَّ لِيُعۡلَمَ مَا يُخۡفِيۡنَ مِنۡ زِيۡنَتِهِنَّ ۲۴/۳۱ = ضرب بمعنی مارنا۔

۲۔ **چلنا**:۔ جب مجاہدین اسلام گھر سے چلکر میدانِ جنگ میں پہنچیں تو حکم ہوتا ہے:۔

● وَاِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَنۡ تَقۡصُرُوۡا مِنَ الصَّلٰوةِ ۴/۱۰۱۔ جب مومن (جہاد کیلئے) زمین میں چلیں تو کوئی حرج نہیں کہ وہ الصلوٰۃ (نماز) کو کم کر لیا کریں۔ ضرب بمعنی چلنا

۳۔ **کاٹنا**:۔ جب مجاہدین اسلام کا میدان جنگ میں کفار کیسا تھ ٹکراؤ ہو تو حکم ہوتا ہے کہ ان کی گردنیں کاٹی جائیں

● فَاِذَا لَقِيۡتُمُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَضَرۡبَ الرِّقَابِ ۴۷/۴۔ ضرب بمعنی کاٹنا

۴۔ **اوڑھنا**:۔ مومنات مسلمات کیلئے ارشاد ہوا ہے کہ اپنے گریبانوں (یعنی پورے سینوں) پر اوڑھنیاں ڈالا

رکھا کریں :۔

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلَىٰ جُيُوبِهِنَّ ۲۴/۳۱ ۔ ضرب بمعنی اوڑھنا۔

۵۔ بیان کرنا :۔ اکملیت قرآن کے ضمن میں ارشاد باری ہے کہ ہم نے اس قرآن میں ہر قسم کے ضروری حالات بیان کر دیئے ہیں :۔

● وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هَٰذَا الْقُرْآنِ مِن كُلِّ مَثَلٍ ۵۸/۳۰ ۔ ضرب بمعنی بیان کرنا۔

پس غور فرمائیگا کہ :۔ مندرجہ بالا مثالوں سے مہر نیمروز کی طرح عیاں ہے کہ :۔ کسی ذومعنی لفظ کا مفہوم، ربط کلام، قرائن سیاق وسباق اور کائناتی مشاہدات کو ملحوظ رکھے بغیر متعین نہیں کیا جائیگا مثلاً اگر مندرجہ بالا مثال ۱ میں جہاں ضرب کا مقامی معنی مارنا ہے۔ اگر وہاں اسکا معنی چلنا، کاٹنا، اوڑھنا یا بیان کرنا لیا جائے تو اگرچہ ضرب کے یہ سب معنے خود قرآن کریم میں مذکور ہیں لیکن یہ مفہوم سراسر غلط ہوگا۔ جیسے کہ مشاہدات عالم ۲۴/۳۱ کے ان ہر چہار مفہوم کی کھلے بندوں تکذیب کر رہے ہیں کہ زیورات والی خواتین اپنے پیروں کیساتھ چلانہ کریں، پیروں کیساتھ کاٹا نہ کریں، پیروں کیساتھ اوڑھانہ کریں، پیروں کیساتھ بیان نہ کیا کریں، یہ سب معنے غلط ہیں پس ثابت ہوا کہ مصدر ضرب سے متعلقہ مندرجہ بالا پانچ آیات کریمات کے، جبتک مذکورہ بالا الگ الگ مفاہیم نہ لئے جائیں۔ اسوقت تک انکا الگ الگ صحیح مقامی معنی برآمد نہیں ہوتا۔ اور ان پانچ مثالوں سے یہ بات بھی نکھر کر عیاں ہو رہی ہے کہ ذومعنی الفاظ کا مفہوم متعین کرنے میں لغت عرب کیساتھ ساتھ خدا تعالیٰ کے خود مقرر کردہ قوانین جاریہ ہی کا سہارا لینا فرض ہے یعنی جس طرح :۔

وَلَا يَضْرِبْنَ بِأَرْجُلِهِنَّ ۲۴/۳۱ میں مصدر ضرب کے معنی متعین کرنے میں خدا تعالیٰ کے خود مقرر کردہ قوانین کائنات ہی کا فیصلہ اٹل ہے کیا ہیں آنت میں چلنا، کاٹنا، اوڑھنا اور بیان کرنا چاروں معنے اسلئے غلط ہیں کہ یہ عالمی مشاہدات کے خداوندی قوانین پر فٹ نہیں آتے۔

پس قرآن فہمی کا بیسواں اصول یہ ہے کہ ذومعنی الفاظ کے معنے قواعد عرب اور مشاہدات عالم کیمطابق لئے جائینگے۔

● **فلهذا** زیر نظر ترجمہ اور تفسیر میں ذومعنی الفاظ کے بالکل وہی معنے لئے گئے ہیں جو ربط کلام، سیاق وسباق۔ اور لغت (قواعد عرب) کے مطابق ہونے کے ساتھ ساتھ خدا تعالیٰ کے خود مقرر کردہ اُن قوانین کائنات میں مشاہدۃً بھی فٹ آتے ہیں۔ جو ہر آن ہمارے گرد وپیش موجود ہیں۔ اور جن کی ہرگز نہ کھلنے والی زنجیروں میں پوری کی پوری موجودات، ابتداءِ آفرینش سے جکڑی ہوئی ہے۔ اور قیامت تک کیلئے جکڑی رہیگی۔

۲۱۔ کلام مقصود اور غیر مقصود میں تمیز کرنا ضروری ہے۔ کلام غیر مقصود بطور مجاز تام آتا ہے قرآن کریم میں آیا ہے :۔

● إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ الْخِيَاطِ ۷/۴۰ = بیشک جو لوگ ہماری آیتوں کو جھٹلاتے ہیں۔ اور ان سے تکبر کرتے ہیں ان کیلئے آسمان کے دروازے

نہیں کھولے جائینگے۔ نہ انہیں اُسوقت تک جنّت میں داخل کیا جائیگا۔ جبتک کہ سوئی کے ناکے سے موٹا رسّہ نہ گزر جائے۔

ء جمل کا معنیٰ اُونٹ بھی ہے اور جہاز کا موٹا رسّہ بھی۔ یہاں سوئی کے ناکے کی مناسبت سے موٹا رسّہ معنیٰ لینا درست ہے۔ اونٹ معنیٰ لینا درست نہیں۔

دیکھیئگا! یہاں کلام مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کریمات کو جھٹلانیوالوں کیلئے جنّت کا داخلہ مطلقًا ناممکن ہے سوئی کے ناکے سے اونٹ یا جہاز کے رسّے کا گزرنا کلام غیر مقصود بطور محال تام آیا ہے۔ لہذا اس سے یہ مفہوم اخذ کرنا منشاءِ قرآنی کے خلاف ہے کہ قانونِ جاریہ کے خلاف کسی معجزاتی یا کراماتی طور پر سوئی کے ناکے سے جہاز کا موٹا رسّہ گزر بھی سکتا ہے۔ اور کسی نبی ولی کی سفارش کیساتھ اللہ تعالیٰ کی آیات کریمات کو جھٹلانیوالوں اور تکبر کیساتھ ان کا مذاق اُڑانیوالوں کا جنّت میں داخلہ بھی ممکن ہے۔ بلکہ بتایا یہ گیا ہے کہ جس طرح سوئی کے ناکے سے باریک دھاگے کی بجائے موٹے رسّے کا گزرنا محالِ تام ہے اسی طرح آیات اللہ کی تکذیب کرنیوالوں کا خدا تعالیٰ کے ہاں کامیاب ہونا بھی محالِ تام یعنی مطلقًا ناممکن ہے۔

فلہٰذا ترجمہ وتفسیر زیرِ نظر میں محالاتِ تامہ کو جن پر مشاہداتِ عالم کی مہرِ تصدیق ہر آن ثبت ہو رہی ہے، قرآن کریم کے کسی مقام پر بھی واقعاتی رنگ دیکر قوانینِ کائنات کی مخالفت نہیں کیگئی۔ بلکہ جس امر پہ کوئی محالِ تام لایا گیا ہے اُسے مطلق نفی کی دلیل مانا گیا ہے۔

پس **قرآن فہمی کا اکیسواں اصول** یہ ہے کہ کلام مقصود اور غیر مقصود میں فرق کیا جائے۔ اور کلام غیر مقصود کا سہارا لیکر قرآن حکیم میں کسی قسم کے چیستانی تصوّرات پیدا کرکے قوانینِ خداوندی کی مخالفت کا ارتکاب نہ کیا جائے۔

۲۲۔ انقسامِ مفہوم مطابق قرآنی کلیات و عالمی مشاہدات

سورہ بقرہ میں آیا ہے کہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کہتے ہیں کہ لوگو! یا یہودی ہو جاؤ یا نصرانی ہو جاؤ۔ تو ہدایت پا جاؤ گے:-

● وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا ۲/۱۳۵

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہود و نصاریٰ کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ یہودی اور نصرانی دونوں ہدایت یافتہ ہیں؟ کیا اگر کوئی نصرانی یہودی ہو جائے تو نصاریٰ اس پر خوش ہوتے اور اُسے ہدایت یافتہ مان لیتے ہیں؟ اور اسی طرح اگر کوئی یہودی نصرانی ہو جائے تو کیا اس پر یہودی خوش ہوتے اور اُسے ہدایت یافتہ گردان لیتے ہیں۔ اس سوال کا جواب اسی سورت کی آیت ۱۱۳ میں دیا گیا ہے کہ یہود و نصاریٰ دونوں ہی ایک دوسرے کو گمراہ کہتے ہیں۔ تو پھر اُن کا متفقہ فیصلہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ یہودیوں کے نزدیک نصرانی اور نصرانیوں کے نزدیک یہودی ہدایت یافتہ ہیں۔ دیکھیئے ارشادِ باری:-

● وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصَارَىٰ عَلَىٰ شَيْءٍ وَقَالَتِ النَّصَارَىٰ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلَىٰ شَيْءٍ ۲/۱۱۳

لہذا اس آیت مجیدہ ۲/۱۱۳ اور یہود و نصاریٰ کی مشاہداتی شہادت سے بالتصریح ثابت ہوا کہ آیت نمبر ۲/۱۳۵ قَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ کا معنیٰ انقسامِ مفہوم کی رُو سے یہ ہو گا کہ یہودی کہتے ہیں یہودی ہو جاؤ تو ہدایت پا لو گے۔ اور نصاریٰ کہتے ہیں نصرانی ہو

جاؤ تو ہدایت یافتہ ہو جاؤ گے۔

۲۲ تحفظِ ناموسِ رسالت سابقہ تراجم و تفاسیر میں قرآن فہمی کے مذکورۃ الصدر اصول کو نظر انداز کرنے سے ناموسِ رسالت تک کا عدمِ تحفظ پایا گیا ہے۔ جیسے کہ سورہ بقرہ میں آیا ہے:۔

● اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝ ۲/۲۱۴۔

اس آیت کے ترجمہ میں سابقہ مشہور مترجمین شاہ رفیع الدین، شاہ اشرف علی، شاہ عبد القادر، سید مقبول احمد شیعہ، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ثناء اللہ صاحبان رحمۃ اللہ علیہم نے یہ مفہوم پیش کیا ہے کہ سابقہ اقوام پر جب سختی کا وقت آتا تھا۔ تو مومنوں کی جماعت اپنے رسول سمیت پکار اٹھتی تھی کہ اللہ کی مدد کب آئیگی۔ یعنی مومن بھی گھبرا جاتے تھے اور رسول بھی گھبرا اٹھتے تھے۔ حالانکہ انقسامِ مفہوم کے قرآنی اصول کے مطابق اس آیت مجیدہ میں اللہ کے رسول اس الزام سے بری ہیں۔ قرآنی کلیہ کے مطابق آیت مجیدہ کا صحیح مفہوم تو ذرا آگے چلکر بیان کیا جائیگا۔ پہلے آپ سابقہ مشہور تراجم میں سے شاہ اشرف علی صاحب مرحوم کا مشہور و مقبول ترجمہ ملاحظہ فرمائیں جس میں دوسرے تراجم کی طرح خود رسولوں کے بھی گھبرا اٹھنے کی خبر دیگئی ہے:۔

"دوسری بات سنو کیا تمہارا خیال ہے کہ جنت میں (بے مشقت) داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ تم کو ہنوز ان (مسلمان) لوگوں کا سا عجیب واقعہ پیش نہیں آیا۔ جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ ان پر (مخالفین کے سبب) ایسی ایسی تنگی اور سختی واقع ہوئی اور (مصائب سے) ان کو یہاں تک جنبشیں ہوئیں کہ (اس زمانے کے) **پیغمبر تک** اور جو ان کے ہمراہ اہل ایمان تھے بول اٹھے کہ اللہ تعالیٰ کی امداد (موعود) کب ہوگی؟ یاد رکھو اللہ تعالیٰ کی امداد بہت نزدیک ہے۔" (ترجمہ شاہ اشرف علی صاحب مرحوم)

غور فرمائیگا! کس طرح اللہ تعالیٰ کے مقدس رسولوں کے عزم و استقلال پر حرف آتا ہے۔ کہ خود پیغمبر تک گھبرا کر پکار اٹھتے تھے کہ اللہ کی مدد کب آئیگی۔ حالانکہ انبیاء سلام علیہم کے متعلق گھبراہٹ کا سوال کیسا۔ مثلاً قوم بنی اسرائیل نے جب حضرت موسیٰ کی معیت میں ہجرت کی اور فرعون تعاقب کرکے ان کے قریب پہنچ گیا تو انہوں نے گھبرا کر کہا۔ اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ۲۶/۶۱، بیشک ہم پکڑے جانیوالے ہیں۔ لیکن حضرت موسیٰ نے فرمایا۔ ہرگز نہیں، میرے ساتھ میرا پروردگار ہے وہ عنقریب مجھے کامیاب کریگا۔ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ۝ ۲۶/۶۲۔

یاد رہے کہ رسل انبیاء کیلئے گھبراہٹ کا تصور اخذ کرنا، صرف قرآنی کلیہ انقسامِ مفہوم کو نظر انداز کرنے کا نتیجہ ہے۔ اب آیتِ بالا ۲/۲۱۴ کا صحیح مفہوم ملاحظہ فرمائیں، جو انقسامِ مفہوم کے قرآنی کلیہ کے مطابق درج ذیل ہے:۔

"ایمان والو! کیا تم نے گمان کر لیا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں آئے جو تم سے پہلے لوگوں

پر آئے تھے۔ انہیں تنگی اور سختی پہنچی۔ اور وہ اِس قدر جھنجھوڑے گئے کہ اللہ کے رسولؐ اور اُسکے ساتھی مومن بول اُٹھے۔ (مومنوں نے کہا) اللہ کی مدد کب آئیگی۔ (اللہ کے رسولؐ نے فرمایا) یاد رکھو کہ اللہ کی مدد قریب ہے، آیا ہی چاہتی ہے۔

دیکھا آپ نے! کہ لف نشر غیر مرتّب کے مطابق "یَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ" کے الگ الگ قول اُسی طرح انقسامِ مفہوم کی رُو سے بکھر کر سامنے آ رہے ہیں، جس طرح "قَالُوْا کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا" میں یہود و نصارٰی کے الگ الگ اور مختلف و متضاد اقوال بالصّراحت موجود ہیں۔

پس **قرآن فہمی کا بائیسواں اصُول** یہ ہے کہ خود قرآنِ حکیم اور عالمی مشاہدات کی مخالفت سے بچنے کے لئے انقسامِ مفہوم کے قرآنی کلیہ پر عمل کرنا ضروری ہے۔

فلہٰذا زیرِ نظر ترجمہ اور تفسیر میں قرآنی ہدایت کے مطابق "انقسامِ مفہوم مطابق کلیاتِ قرآنیہ و مشاہداتِ عالم" کو بھی اُسکے ہر مقام پر مدِّنظر رکھا گیا ہے۔ اور اِس قرآنی اصُول کو بھی ہرگز نظرانداز نہیں گیا۔

۲۳۔ تشریحِ الفاظ وآیات بذریعہ تقابلِ ضِدّین

قرآنِ حکیم میں قرآن فہمی کا ایک اور اصُول بھی مذکور ہے۔ وہ یہ کہ خدا تعالیٰ نے اپنی کتابِ مقدّس کے مخصوص اسلوبِ بیان میں ایک انداز یہ بھی رکھا ہے۔ کہ بعض مقامات پر الفاظ و اصطلاحات کا مفہوم تقابلِ ضِدّین کے ذریعہ بھی واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ مثلاً الفاظ کی وضاحت کیلئے نُور کی ضِد ظلمت، لیل کی ضِد نہار، ہدایت کی ضِد ضلالت اور جنّت کی ضِد جہنّم وغیرہ لاکر تشریح کر دیتا ہے یہی حال ہے اصطلاحات کا۔ مثلاً قرآنِ کریم کی ایک اصطلاح ہے **الصَّلٰوۃ**۔ جس کا عام طور پر صلوٰۃِ موقّت (نماز) ہی معنٰی لیا جاتا ہے لیکن خدا تعالیٰ نے تقابلِ ضِدّین کے ذریعہ اِس اصطلاح کا ایک معنٰی بتایا ہے "پُوری پُوری فرمانبرداری کرنا"۔ جیسے کہ سورہ قیامت میں نافرمان انسان کے متعلق ارشاد ہُوا ہے :۔

فَلَا صَدَّقَ وَ لَا صَلّٰیۙ ۷۵/۳۱

وَلٰکِنْ کَذَّبَ وَ تَوَلّٰیۙ ۷۵/۳۲ .... پس :۔

یہی تقابلِ ضِدّین ملاحظہ ہو کہ صَدَّقَ کی ضِد کَذَّبَ آئی ہے۔ اور صَلّٰی کی ضِد تَوَلّٰی یعنی رُوگردانی، نافرمانی آئی ہے یعنی سچ کے مقابلے پر جھوٹ اور صلوٰۃ کے مقابلے پر نافرمانی لاکر وضاحت کر دی ہے کہ صلوٰۃ کا ایک معنٰی نافرمانی کی ضِد فرمانبرداری ہے۔

پس **قرآن فہمی کا تئیسواں اصُول** یہ ہے کہ مفہومِ قرآن کیلئے اُسکے پیش کردہ تقابلِ ضِدّین کو ہمیشہ نگاہ میں رکھا جائے فلہٰذا زیرِ نظر ترجمہ و تفسیر میں تقابلِ ضِدّین کے قرآنی کلیہ سے بھی پُورا پُورا استفادہ کیا گیا ہے۔

۲۴۔ جملہ ہائے اعتراض

قرآنِ کریم کے اسلوبِ بیان کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اُسکی آیاتِ کریمات میں جملہ ہائے اعتراض بھی موجود ہیں۔ اگر آیاتِ مجیدہ میں مذکور معترضہ جملے کو الگ کر کے تقدیرِ کلام مرتب کی جائے تو فہمِ قرآن

بالکل آسان ہو جاتا ہے۔ مثلاً ذیل کی آیت مجیدہ پر غور فرمائیں۔ اس میں خط کشیدہ الفاظ جملہ معترضہ ہے:-

● وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

۷/۴۲ - خط کشیدہ جملہ، جو اس آیت میں جملہ معترضہ ہے، اگر الگ نہ کیا جائے تو اسکا ترجمہ یہ ہے:-

"اور جو لوگ ایمان لائیں اور اصلاح کے کام کریں، ہم کسی پر اسکی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ وہ اہل جنت ہیں اس میں ہمیشہ رہینگے"۔

متن اور ترجمہ دونوں کے خط کشیدہ حصوں پر غور فرمائیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آیت مجیدہ سے انکا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن یاد رکھیئےگا۔ کہ قرآن کریم کا یہ مستقل و مخصوص طرز بیان ہے کہ عموماً ہر اعتراض کا جواب جو کسی جملے پر پیدا ہوتا ہو، جملہ ہائے اعتراض کی صورت میں، ساتھ کیساتھ دیتا چلا جاتا ہے۔ اس آیت مجیدہ میں "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے الفاظ سے ہر ذہن پر الگ الگ دباؤ پڑتا ہے کہ نہ جانے اعمال صالحہ کتنی مشکل چیز ہے جو شائد مجھ سے ادا نہ ہو سکے۔ فلہذا قرآن کریم نے آگے بڑھنے سے پہلے اس سوال کا جواب دیدیا ہے کہ اعمال صالحہ کا معیار ہر شخص کی ذاتی وسعت کے مطابق ہے۔ ہم کسی فرد پر اس کی طاقت سے زائد بوجھ ڈالتے ہی نہیں۔ اس طرح ذہنی بوجھ کو ہلکا کرنے اور ذہن میں پیدا ہونے والے سوال کا جواب دے چکنے کے بعد "اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ" کے متعلق ارشاد فرمایا ہے "اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ" یہی لوگ اہل جنت ہیں وہ اس میں ہمیشہ رہینگے۔ فلہذا آیت مجیدہ کے مفہوم کو آسان تر کرنے کیلئے جملہ معترضہ کو الگ کر لینے سے تقدیر کلام یہ ہے:-

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ...جملہ معترضہ... اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○

(مفہوم) اور جو لوگ ایمان لائے اور اصلاح کے کام کئے ...جملہ معترضہ... یہی لوگ اہل جنت ہیں۔ وہ اس میں ہمیشہ رہینگے۔

جملہ ہائے اعتراض کا اسلوب قرآن کریم میں اس طرح بھی موجود ہے کہ ربط کلام کے مطابق بعض جگہ جملہ معترضہ سو سو ڈیڑھ ڈیڑھ سو آیات کریمات پر مشتمل بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً سورہ نساء میں وراثت کے مسائل آیت نمبر ۱۱ تا ۱۳ میں، اِذْ يُوْصِيْكُمُ اللّٰهُ تا تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ...... الخ بیان ہوئے ہیں۔ اور انکا تتمہ آیت نمبر ۱۷۶ میں آیا ہے۔

پس قرآن فہمی کا چوبیسواں اصول یہ ہے کہ جملہ ہائے اعتراض کو نگاہ میں رکھا جائے۔

۲۵۔ قرآن کریم اپنی لغت آپ پیش کرتا ہے

انسانی لغت تغیر پذیر ہوتی ہے۔ تغیر زمانہ کے ساتھ ساتھ بعض الفاظ کا مفہوم بھی بدل بدل کر کچھ سے کچھ ہو جاتا ہے۔ مثلاً صبر، شکر، توکل، دین، صلوٰۃ، زکوٰۃ وغیرہ بیسیوں الفاظ ہیں جن کا مفہوم بدل چکا ہے۔ لیکن خدائے علیم و خبیر نے اس مشکل کا حل بھی اپنی مکمل و اکمل کتاب مجید میں خود محفوظ کر کے اپنے تغیر پذیر لغتوں سے بے نیاز کر دیا ہوا ہے۔ اسکے نہ صرف الفاظ، بلکہ انکا مفہوم بھی زمانے کی دست برد سے محفوظ کر دیا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ○ ۱۵/۹ ___ مثلاً لفظ:-

۲۵/۱ - **صبر** کا معنیٰ آج خود عربوں کے ہاں خصوصاً، اور عجمیوں کے ہاں عموماً یہ متعین ہو چکا ہے کہ مصائب زمانہ اور ظالموں

کے ظلم کو انتہائی بے بسی کیساتھ برداشت کرتے چلے جانا صبر ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہ مدِمقابل کو کہدیا جائے کہ میرا تو صبر ہی ہے حالانکہ قرآن حکیم نے بالفاظِ واضح، صابرین کی تعریف میں صبر کے معنے خود متعین کردیئے ہیں "شاہراہِ زندگی میں پیش آنیوالی ہر مصیبت کا اس طرح سینہ تان کر مقابلہ کرنا کہ سستی کمزوری اور بددلی قریب تک نہ پھٹکنے پائیں"۔

● وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ○ $\frac{3}{146}$ = اور نبیوں میں سے بہت سے نبی ایسے تھے کہ جن کی معیت میں بہت سے رب والوں نے (مخالفین ربوبیت کیساتھ جنگ کی۔ پھر اللہ کی راہ میں ان پر جو مصیبت آئی نہ اس سے وہ سست گام ہوئے نہ ان میں کمزوری ہی آئی، اور نہ وہ (تھک ہار کر کوشش چھوڑ کر) بیٹھ گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صابرین (یعنی مشکلوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرنیوالوں) کو پسند کرتا ہے۔ اسی طرح :۔

$\frac{25}{2}$ ۔ شکر

کا معنیٰ بھی قرآنی لغت کے خلاف متعین ہو چکا ہے کہ ناہموار نظام کی غلط بخشیوں کی بدولت، اگر بھوک ننگ اور ذلت و مسکنت کسی پر مسلط ہوتی چلی جائے تو اس پر خوش رہے۔ اور یہ کہے کہ باری تعالیٰ تیرا شکر ہے کہ تو نے مجھ پر کہیں اس سے بڑی ذلت مسلط نہیں کردی۔ حالانکہ خدا تعالیٰ نے بھوک ننگ کا نہیں، بلکہ نعمتوں کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے :۔

● وَاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ $\frac{16}{114}$ ۔ اللہ تعالیٰ کی نعمت کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کے فرمانبردار ہو۔ سورہ دہر میں شکر کا معنیٰ "محنت و کوشش کا بھرپور نتیجہ" بتایا گیا ہے ــــ چنانچہ اہلِ جنت کے متعلق ارشاد ہوا ہے

● وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ○ $\frac{76}{12}$ = ان کے مستقل مزاج رہنے کا بدلہ ہے جنت اور ریشم ــــ انہیں کہا جائیگا

● اِنَّ هٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَآءً وَّكَانَ سَعْيُكُمْ مَّشْكُوْرًا ○ $\frac{76}{22}$ = بیشک یہ تمہارے اپنے عملوں کا بدلہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ تمہاری سعی مشکور ہے (یعنی تمہاری محنت و کوشش کا یہ بھرپور نتیجہ ہے جو تمہیں میسر آیا ہے) ــــ سورہ بقر میں آیا ہے :۔

● فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ $\frac{2}{158}$ = پس اللہ تعالیٰ محنت کا بھرپور ثمر عطا کرنیوالا صاحب علم ہے

پس قرآنی لغت کی رو سے شکر کا معنیٰ ہے ایسی بھرپور کوشش کرنا، کہ اسکا بھرپور نتیجہ برآمد ہو۔ خواہ وہ کوشش قوانین کائنات سے متعلق ہو، خواہ قوانین شرعیہ سے متعلق۔

$\frac{25}{3}$ ۔ توکّل

صبر اور شکر کے بعد توکّل کا معنیٰ بھی مطلقاً غیر قرآنی مشہور ہو چکا ہے کہ جو کام بلا سوچے سمجھے کیا جائے یا جسکی تکمیل کے اسباب موجود ہی نہ ہوں، تو اسکے لئے کہا جاتا ہے توکّل بر خدا۔ حالانکہ قرآن کریم نے معاملہ درپیش کے متعلق پہلے تو خود حضور کو صحابہ کیساتھ مشاورت کا حکم دیا ہے :۔ ● وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ $\frac{3}{159}$ اور جب آپس کے پورے غور و خوض کیساتھ لائحہ عمل مرتب کرلیا جائے۔ تو پھر ارشاد ہوتا ہے :۔ ● فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ $\frac{3}{159}$ پھر جب تو

باہمی مشاورت کے بعد طے شدہ پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ کرے تو پھر اس پروگرام پر پورا پورا عمل کرتے ہوئے اللہ پر توکل کرے۔

دیکھا آپنے! کہ قرآنی لغت میں بلاسوچے سمجھے کام کرنے کو توکل نہیں بتایا گیا۔ بلکہ کابینہ کا بورڈ بٹھا کر اور معاملہ زیر پیش کے ہر پہلو پر نگاہ رکھتے ہوئے لائحہ عمل مرتب کرنے اور اس پر پورا پورا عمل کرنے کو توکل کہا ہے۔ توکل کا لفظی معنی ہے بھروسہ کرنا۔ اب ظاہر ہے کہ معاملہ درپیش کے متعلق مجلس مشاورت میں جو طریق کار مرتب کیا جائیگا۔ اسکا خدا تعالیٰ کے اُن کائناتی قوانین کے عین مطابق ہونا لازم ہے۔ جن کے متعلق خدا تعالیٰ کا فیصلہ ہے لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۱۰/۶۴ اور فَلَن تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا ۳۵/۴۳۔ اور یہی وہ قوانین خداوندی ہیں جو کبھی دھوکا نہیں دیتے۔ مثلاً یہ امر ناقابل تردید ہے کہ لوہا پانی میں ڈوب جاتا ہے لیکن جب اسکی چادر بنا کر جہاز بنالیا جائے۔ تو قوانین خداوندی کے مطابق۔ یہ کہ لوہا خود تیرنے لگتا ہے۔ بلکہ سینکڑوں افراد کو بھی سمندر پار لے جاتا ہے۔ اسی طرح قوانین خداوندی کے مطابق ریلیں، موٹریں اور ہوائی جہاز وغیرہ اُسوقت تک کبھی دھوکا نہیں دیتے جبتک حضرت انسان سے کوئی قانونی تقصیر واقع نہ ہو۔ فلہذا قرآنی لغت کے مطابق خدا تعالیٰ کے خود پیدا اور مقرر کردہ قوانین کائنات پر بھروسہ کرنا توکل علی اللہ ہے۔

۲۵/۴ دین

اِسی طرح ایک لفظ ہے "دین"۔ جس کے معنے رسمی نماز روزہ لے لیا گیا ہے۔ اور محض نماز روزہ ادا کرنیوالے کو کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا دیندار ہے۔ خواہ وہ اصل دین یعنی ربوبیت عامہ کے تصور تک سے ناآشنا ہو۔ قرآن کریم نے سورہ یوسف میں دِينِ الْمَلِكِ ۱۲/۷۶ یعنی شاہ مصر کا قانون اور سورہ نور میں زانی اور زانیہ کو سزا دینے میں رعایت نہ برتنے کے حکم میں وَلَا تَأْخُذْكُم بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِينِ اللّٰهِ ۲۴/۲ کے الفاظ لاکر کہ اللہ کے قانون میں تمہیں ان پر رحم نہیں آنا چاہیئے خود بتا دیا ہے کہ دین کا ایک معنیٰ قانون ہے۔ کسی بادشاہ کا قانون ہو تو اسے دین الملک کہا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قانون دین اللہ کہلاتا ہے۔ قانون کی اساس چونکہ عدل و انصاف پر قائم ہوتی ہے۔ اسلئے قرآن نے یَوْمُ الدِّينِ کہا ہے عدل و انصاف کے دن، یعنی بدلے کے دن کو — اُوپر بتایا جا چکا ہے کہ:۔

قرآنی لغت کے مطابق اصل دین ہے ربوبیت عامہ — قرآن کریم کی بنیادی تعلیم صرف اور صرف ربوبیت عامہ ہے۔ جیسے کہ اس مقدس ضابطہ حیات کی ابتدا بھی ربوبیت عامہ ہی سے ہوئی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِينَ ۱/۱۔ اور اسکا اختتام بھی ربوبیت عامہ ہی پر ہوا ہے۔ قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۱۱۴/۱۔ چنانچہ سورہ ماعون میں بالصراحت بتا دیا گیا ہے کہ

ربوبیت عامہ ہی دینِ الٰہی ہے:۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ ۝	اللہ صاحب بخشش عامہ اور رحمت خاصہ کے نام کیسا تھ غور کر
أَرَأَيْتَ الَّذِي يُكَذِّبُ بِالدِّينِ ۝ فَذٰلِكَ الَّذِي يَدُعُّ الْيَتِيمَ ۝ وَلَا يَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ	کیا تو نے اس شخص پر غور نہیں کیا، جو اللہ کے دین کو جھٹلاتا ہے۔ یہ وہ ہے جو بے سہارہ لوگوں کو دھکے دیتا ہے، اور جو

الْمِسْكِيْنِ ۝ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۝ وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ ۝

افراد کسی وجہ سے ساکن ہو جائیں، اُن کی غذائی ضروریات تک بہم پہنچانے کی ترغیب نہیں دیتا۔ تباہی ہے اُن مُصلّین (نمازیوں) کیلئے جو اپنی صلوٰۃ سے بے خبر ہیں۔ جو نمازیں دکھلاوے کی پڑھتے ہیں۔ اور رزق کے سرچشموں کو روک دیتے ہیں (کہ وہ ضرورتمندوں تک پہنچنے نہ پائیں)

دیکھا آپ نے: آیاتِ بالا میں کس وضاحت کیساتھ بتایا گیا ہے کہ قرآنی لغت کی رُو سے **دین** کا معنی بلا تمیز اعلےٰ و ادنےٰ سب کی ربوبیّت کرنا ہے۔ اور جو لوگ رزق کے سرچشموں پر قابض ہو کر ربوبیّتِ عامہ میں رکاوٹ بن جائیں وہ دین کو جھٹلانے والے ہیں۔ یعنی اللہ کے دین کی تصدیق ربوبیّتِ عامہ کو بروئے کار لانا ہے۔ اِسی آئینِ ربوبیّت کو قرآنِ کریم میں الدّین کہا گیا ہے۔ اور اِسی آئین سے متعلقہ بازپُرس کے دن کو **یومُ الدّین** کہا ہے۔

۲۵/۵ سحر: اِس لفظ کا معنی عام تفاسیر و تراجم میں لیا گیا ہے جادُو۔ اور جادُو سے مُراد لی جاتی ہے نام نہاد کالا علم یعنی زبان سے کچھ الفاظ ادا کیئے جائیں اور آدمی کا گھوڑا یا گھوڑے سے مکھّی بن جائے۔ قرآن کریم نے تقابلِ ضدّین کے ذریعہ سحر کا معنی بتایا ہے جھُوٹ۔ کیونکہ یہ لفظ قرآن کریم میں حق کے مقابلے پر لایا گیا ہے :۔

فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْٓا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ ۱۰/۷۶ (پس جب اُن کے پاس ہماری طرف سے حق سچ آگیا تو اُنہوں نے کہا کہ یہ ظاہرا سحر (ظاہرا جھوٹ ہے) — جھُوٹ چونکہ دھوکا دہی کیلئے بولا جاتا ہے اِسلئے قرآن نے سحر کا معنی دھوکا بھی بتایا ہے :۔

قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ...... قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ ۝ ۲۳/۸۶ تا ۸۹ = اے رسُول! اِن سے پوچھیگا کہ یہ اَن گنت سماوات اور یہ عظیم سلطنت کس کی ہے۔ وہ ضرور کہینگے اللہ کی ہے ...... آپ کہدیجیگا کہ پھر تم کو کہاں سے سحر ہو گیا ہے یعنی پھر تمہیں خدا کیساتھ شریک کرنے میں کہاں سے دھوکا لگ گیا ہے پس قرانی لغت کیمطابق سحر کا معنی جھوٹ اور دھوکا ہے جادُو نہیں۔

۲۵/۶ اِذن: اسی طرح کا ایک لفظ ہے اِذن۔ جس کا معنی اجازت و حکم بھی ہے اور قانون بھی :۔ ● اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۲۲/۳۹ = جن لوگوں کیساتھ جارحانہ جنگ کی جائے۔ انہیں مدافعانہ جنگ کی اجازت دیگئی ہے۔ یہ نوہُوا اِذن بمعنی اجازت۔ اِسکے علاوہ قرانی لغت کی رُو سے اِذن کا معنی قانون بھی ثابت ہے :۔ ● فَاَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ...... وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِاِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِيْ خَبُثَ لَا يَخْرُجُ اِلَّا نَكِدًا ۭ ۷/۵۷-۵۸ = پس ہم اُس بادل کے ذریعہ پانی نازل کرتے ہیں۔ پھر ہم اُس پانی کیساتھ ہر قسم کے میوے

نکالتے ہیں۔ اور جو عمدہ زمین ہے اُسکی نباتات اللہ کے اِذن (قانون) کیساتھ عمدہ اور تندرست پیدا ہوتی ہے۔ اور جو خبیث یعنی ناقص زمین ہے اُس میں سے اللہ کے اِذن یعنی قانون سے ناقص پیداوار ہی نکلتی ہے ـــــ دیکھئے اِن آیات کریمات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے اِذن کیساتھ عمدہ زمین سے عمدہ پیداوار نکلتی ہے اور ناقص زمین سے ناقص پیداوار پیدا ہوتی ہے۔ اور یہی خدا تعالیٰ کا قانونِ جاریہ ہے۔ جس کیلئے اِذن کا لفظ لایا گیا ہے۔ پس ثابت ہُوا کہ خود قرآنی لُغت کی رُو سے اِذن بمعنی قانون بھی ہے۔ خدا تعالیٰ نے اپنے قانون کی اِس حد تک اہمیّت بیان فرمائی ہے کہ قرآن کریم کے متعلق جو مشہور ہے کہ اِسکی آیاتِ کریمات کے ساتھ خرقِ عادات کا ظہور ہو سکتا ہے۔ ایسے نظریات تک کا بطلان کر کے اعلان کر دیا گیا ہے کہ جادو سحر وغیرہ کا روئے زمین پہ وجود تک ہی موجود نہیں۔ جیسے کہ ارشادِ باری ہے :- ● وَلَوْ اَنَّ قُرْاٰنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ اَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْاَرْضُ اَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتٰى ؕ بَلْ لِّلّٰهِ الْاَمْرُ جَمِيْعًا ○ (۱۳/۳۱) - اگر (کوئی پڑھنے کی چیز یعنی) کوئی قرآن ایسا ہوتا، جس سے پہاڑ چلائے جا سکتے۔ یا اُس سے زمین کی مسافت طے کی جا سکتی، یا اُسکے ذریعہ مُردوں کیساتھ باتیں کی جا سکتیں (تو اِس قرآن کے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا تھا۔) حقیقت یہ ہے کہ سب کے سب کام اللہ ہی کیلئے ہیں یعنی اللہ کے قانون کے مطابق ہی طے پاتے ہیں ـــ اب امر بمعنی قانون بھی قرآن کریم ہی کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۵/۷ - اَلْاَمْرُ

امر بمعنی کام اور حُکم بھی آیا ہے :- وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (۳/۱۵۹) - اے رسُول! اہم کاموں، مہموں کیلئے صحابہ کیساتھ مشورہ فرمایا کریں ـــ لیکن امر بمعنی قانون بھی قرآنِ کریم میں آیا ہے :- ● اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ (۲۲/۶۵) - کیا تُو نے غور نہیں کیا یعنی تجھے غور کرنا چاہیئے کہ بیشک زمین میں جو کچھ بھی ہے اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، خصوصاً کشتیاں، جو سمندر میں اللہ کے امر (قانون) کیساتھ چلتی ہیں ـــ دیکھئے یہاں بتایا گیا ہے کہ کشتیاں اللہ کے امر کیساتھ چلتی ہیں۔ اب اظہر من الشمس ہے کہ کشتیاں اور لوہے کے بڑے بڑے جہاز اُسی وقت سمندروں میں تیرتے ہیں۔ جب خدا تعالیٰ کے اُس قانون کے مطابق بنائے گئے ہوں جو اُس نے خود مقرر کر دیا ہُوا ہے کہ پانی میں تیرتی صرف وہ چیز ہے جو اپنے حجم کے پانی کے وزن سے ہلکی ہو۔ اور جو چیز اپنے حجم کے پانی کے وزن سے بھاری ہو، وہ ڈوب جاتی ہے۔ پس یہی اللہ تعالیٰ کا قانون ہے۔ جس کیلئے اِس آیت میں امر کا متبادل لفظ آیا ہے وَالْفُلْكَ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ۔

۲۵/۸ - قرآن کریم میں بعض مقامات پر لفظ اللہ سے مراد اللہ کا قانون ہے

۱- سورۂ نساء میں منافقوں کے ایک قول کے متعلق ارشاد ہُوا ہے :- ● وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ؕ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ○ (۴/۷۸) ـــــ عام تراجم میں اِس آیت کا معنی یہ لیا گیا ہے کہ :- اِن منافقوں کو اگر کوئی فائدہ پہنچتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے۔ اور اگر کوئی نقصان پہنچتا ہے تو (اے رسُول! آپ کو) کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے۔ آپ کہہ دیجئیگا کہ (نفع نقصان) سب اللہ کی طرف

سے ہے۔ پھر انہیں کیا ہوگیا ہے کہ یہ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے۔ (ملخص تراجم شاہ اشرف علی صاحب، مولوی احمد علی صاحب، مولوی ثناء اللہ صاحب اور مقبول احمد شاہ صاحب شیعہ)

۲۔ اب دیکھئے! اس کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ کا مفہوم، روائتی تراجم نے یہ لیا ہے کہ، نفع اور نقصان، سُکھ اور دُکھ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ کتب روایات میں ہے کہ بھلائی اور برائی روز ازل کی لکھی ہوئی ہے۔ (بخاری شریف کتاب الصلوٰۃ) لیکن آیت بالا میں منافقوں کو اسی روائتی مفہوم کی مخالفت پر تنبیہ کیگئی ہے کہ انہیں کیا ہوگیا ہے کہ یہ بھلائی کو اللہ کی طرف اور برائی کو رسول کی طرف کیوں منسوب کرتے ہیں۔ بلکہ چاہئیے یہ کہ بھلائی اور برائی دونوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کریں — لیکن یہاں ایک ایسی ٹھوکر کھائی گئی ہے کہ اگر اس کو سمجھا نہ جائے، اور آیت بالا کا مفہوم منشاء خداوندی کے مطابق نہ لیا جائے تو اس سے اگلی آیت مجیدہ معاذ اللہ استغفر اللہ منافقوں کے قول کی تصدیق اور خداوندی قول کی تکذیب کرتی ہے دیکھئے ارشاد ہوتا ہے:۔

● مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۴/۷۹ = اور اے رسولؐ! آپ کو جو بھلائی پہنچی ہے۔ پس وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور جو آپکو برائی پہنچتی ہے وہ خود آپ کی طرف سے ہے — اب غور فرمائیگا: کہ ۴/۷۸ میں منافقوں کے متعلق بھی قرآن کے اسی قول کی خبر دیگئی ہے کہ بھلائی اللہ کی طرف سے ہے اور برائی آپ کی طرف سے ہے۔ اور یہاں خود بھی یہی کچھ کہا جا رہا ہے کہ بھلائی اللہ کی طرف سے اور برائی آپ کی طرف سے ہے۔ تو پھر منافقوں پر لَا يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا کی تنبیہ نازل کرنا کہاں کا انصاف ہوا؟

حقیقت حال

اب چونکہ اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے کہ اگر منافق بھلائی کو اللہ کی طرف اور برائی کو رسولؐ کی طرف منسوب کریں تو انہیں تو ڈانٹ پلا دے۔ اور آپ اگلی ہی آیت میں وہی کچھ کہدے جس پر منافقوں کو تنبیہ کیا گیا ہے۔ لہٰذا دیکھئے کہ الفاظ ہے ۴ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ میں لفظ اللہ سے مراد اللہ ہے۔ اور کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ میں لفظ اللہ سے مراد اللہ کا قانون ہے۔ دو آیت مجیدہ ۴/۷۹ اسی مفہوم کی تائیدی اور تفسیری آیت ہے۔ اب ہر دو آیات کریمات کا مسلسل قرآنی مفہوم ملاحظہ فرمائیں:۔

وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۭ	اور اگر انہیں کوئی بھلائی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور اگر انہیں برائی پہنچتی ہے تو (اے رسولؐ!) آپکو کہتے ہیں کہ یہ آپ کی طرف سے ہے۔ (یعنی آپکی غلط تدبیر کا نتیجہ ہے)
قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ	آپ کہدیجیئگا کہ حقیقت یہ ہے کہ بھلائیاں اور برائیاں سب اللہ کے قانون کے مطابق آتی ہیں پھر
فَمَالِ هٰٓؤُلَاۗءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ حَدِيْثًا ۴/۷۸ ○	انہیں کیا ہوگیا ہے کہ یہ بات کو سمجھنا چاہتے ہی نہیں۔

یعنی واضح یہ کیا گیا ہے کہ مثلاً اگر راہ میں پڑے ہوئے پتھر سے بچ کر نکل جائیں تو ٹھوکر نہیں لگتی، یہ بھلائی بھی اللہ کے قانون کے

مطابق آتی ہے کہ پاؤں اسلئے محفوظ رہا ہے کہ پاؤں اور پتھر کا تصادم نہیں ہوا۔ اور اگر غفلت و بے توجہی کی بدولت پاؤں اور پتھر میں تصادم ہو جائے تو یہ تکلیف و برائی بھی اللہ کے قانون کے مطابق آتی ہے کہ پاؤں اور پتھر کے تصادم میں پتھر کا کچھ نہیں بگڑیگا پاؤں ہی زخمی ہوگا — چنانچہ منافقوں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ جہاں برائیاں، سیئات کسی غلط تدبیر کا نتیجہ ہوتی ہیں، جو قانونِ خداوندی کی مخالفت پر مبنی ہوتی ہے۔ وہاں حسنات بھی حسن تدبیر کا نتیجہ ہیں جو قانونِ خداوندی کی موافقت کا ماحصل ہوتا ہے اور اس مستقل قانون کے مطابق اگلی آیت مجیدہ میں خود آنحضور کو بھی متنبہ کر دیا گیا ہے کہ آپ بھی ہمارے اس قانون سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ اوپر تو منافقوں کا تذکرہ تھا۔ لیکن اس سے آگے آپ بھی سن لیجیئگا:۔

مَآ اَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۖ وَمَآ اَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۚ وَاَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُوْلًا ۚ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ○ $\frac{4}{79}$

(اے رسول!) خود آپ کو بھی جو بھلائی پہنچیگی۔ وہ بھی اللہ کے قانون کے مطابق ہی پہنچیگی (یعنی وہ آپ کے اُن افعال کا نتیجہ ہوگی جو قانونِ خداوندی کے مطابق ہونگے) اور آپ کو جو تکلیف پہنچیگی (وہ بھی اللہ کے قانون کے مطابق پہنچیگی) وہ خود آپ کی طرف سے ہوگی (یعنی کسی تدبیری کمزوری کا نتیجہ ہوگا۔[1] ہمارا قانون کسی کی رعایت نہیں کرتا) ہم نے آپ کو لوگوں کیلئے پیغام رساں بنا کر بھیجا ہے۔ (قانونِ مشیت میں دخیل نہیں بنایا) اور اس پر خود اللہ تعالیٰ ہی کافی گواہ ہے

آیاتِ بالا میں آپ نمبر ۱، اور نمبر ۲ کی بحث میں دیکھ چکے ہیں کہ اگر روایاتی تراجم کے مطابق یہاں لفظ اللہ سے مراد، اللہ کا قانون نہ لیا جائے۔ تو پہلے نمبر پر آیات نمبر $\frac{4}{78}$ اور $\frac{4}{79}$ میں تضاد و تخالف پایا جاتا اور یہ باہم متصادم پائی جاتی ہیں اور دوسرے نمبر پر معاذ اللہ معاذ اللہ قولِ الٰہی کی تکذیب اور منافقین کے قول کی تصدیق ہوتی ہے۔
فاھذا ترجمہ اور تفسیر زیر نظر میں ان آیات کریمات کے فیصلے کے مطابق کہ قرآنی لغت میں لفظ اللہ سے اللہ کا قانون بھی مراد ہے۔ اسلئے سیاق و سباق اور ربطِ کلام کے مطابق بعض مقامات پر اللہ سے مراد اللہ کا قانون لیا گیا ہے۔

---

[1] ہمیں ناموسِ رسالت ہر آن عزیز ہے۔ تدبیری کمزوری کے الفاظ سے کوئی حرف آنحضرت کی ذاتِ اقدس پر ہماری طرف سے تصور نہ کریں۔ یہ بالکل اُسی طرح ہے کہ جیسے ایک جنگ کے موقعہ پر کچھ منافقوں نے عذر بہانے کرکے جنگ میں عدم شمولیت کی اجازت لے لی تھی۔ اور اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو متنبہ فرمایا تھا۔ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ $\frac{9}{43}$ = آپنے کیوں اجازت دیدی ہے۔ اور اس طرح جو نقصان ہوا اسکی وضاحت آیت مجیدہ کے اگلے الفاظ میں کی گئی ہے:۔ ● حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ○ $\frac{9}{43}$ = اس طرح آپ پر سچے مسلمان نکھر کر عیاں ہو جاتے۔ اور جھوٹوں یعنی منافقوں کو آپ جان لیتے۔

۲۶ — اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ

جس طرح قرآنی الفاظ کے معانی کے ضمن میں سابقہ تفاسیر و تراجم میں نفسِ مضمون، سیاق و سباقِ کلام اور حقیقتِ حال سے بے اعتنائی برتی گئی ہے۔ اسی طرح بعض جملوں کیساتھ بھی ایسا ہی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کا ایک جملہ ہے :- اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ۔

۲۶/۱ حکم صرف اللہ تعالیٰ کا ہے

سابقہ تفاسیر و تراجم نے اس جملہ کا یہ مفہوم لیا ہے کہ اَطِیْعُوا اللّٰہَ سے مُراد ہے قرآن کی اطاعت اور اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ سے روایات کی اطاعت مقصود ہے۔ یعنی اس آیت کریمہ سے دینِ اسلام میں، اللہ تعالیٰ اور رسولِ مقبول کی دو الگ الگ اطاعتوں کا تصوّر دیا جاتا ہے لیکن آیتِ ذیل کے مطابق قرآن کریم کی رُو سے اللہ اور رسول کی الگ الگ دو اطاعتوں کا تصوّر تک پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اطاعت ہوتی ہے حکم کی۔ اور صاحبِ حکم صرف اللہ تعالیٰ ہے :-

● اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ۶/۵۷ + ۱۲/۴۰ = اللہ کے سوا کسی کا حکم ہے ہی نہیں — نیز فرمایا ہے :-

● لَا یُشْرِكُ فِیْ حُکْمِہٖۤ اَحَدًا ۝ ۱۸/۲۶ = وہ اپنے حکم میں کسی ایک کو بھی شریک نہیں ٹھہراتا — آنحضور سلام علیہ خود بھی خدا تعالیٰ ہی کے مطیع تھے۔ اور صحابہ کو بھی خدا تعالیٰ ہی کی اطاعت کا حکم دیا کرتے تھے نیز ہر نبی رسول کا یہی حال تھا۔

لہ آنحضور کو حکم تھا :- ● اِتَّبِعْ مَاۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۶/۱۰۵ + ● وَاتَّبِعْ مَا یُوْحٰۤی اِلَیْكَ ۱۰/۱۰۹ = اے رسول اس کتاب کی اتباع کیجیئگا، جو آپ کی طرف آپکے رب کی طرف سے وحی کی گئی ہے — اور اس حکم کی (باقی حاشیہ صفحہ نمبر ۶۰)

۲۶/۲ - اللہ کے رسول اپنی نہیں بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی اطاعت کراتے تھے۔

● مَاكَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ ۳/۷۹

(مفہوم) اور نہیں لائق واسطے اُس بشر کے کہ اللہ اُسے اپنی کتاب دے، اور (کتاب کے ساتھ) حکم (کرنے کا اختیار) دے۔ یعنی اُسے خلعتِ نبوت عطا کرے۔ پھر وہ لوگوں کو یہ کہے کہ اللہ کے ساتھ ساتھ میرے بھی بندے بنو۔ (یعنی اللہ کی اطاعت بھی کرو اور میری اطاعت بھی کرو)، بلکہ (اُسکا فرض ہے کہ یہ کہے، لوگو!) رب والے بن جاؤ۔ (خالص اللہ کا حکم مانو) کیونکہ تم اللہ ہی کی کتاب کی تعلیم و تدریس کرتے ہو۔

۲۷/۲ - اصل مطاع اللہ تعالیٰ ہے

فلہذا اللہ کے نبی رسول تو لوگوں کو رب والے (یعنی خالص خدا تعالیٰ کے فرمانبردار) بنانے کیلئے مبعوث کئے جاتے تھے، اپنی اطاعت کروانے کیلئے نہیں آتے تھے ـــ پس مسئلہ زیرِ بحث پر جب اِس قرآنی اصول کے مطابق غور کیا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور صاحبِ حکم ہے ہی نہیں۔ تو جملہ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا مفہوم خود لفظ رسول کے اندر سے پھوٹ پھوٹ کر عیاں ہو جائیگا۔ کہ رسول اللہ کا معنی اللہ کا پیغام پہنچانے والا ہے۔ نہ کہ اپنا کوئی حکم دینے والا۔ اور جناب آنحضور بدلائل ذیل، اللہ کا پیغام پہنچانے والے تھے:-

● مَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۳/۱۴۴ = محمد صرف اللہ کا پیغام پہنچانے والے ہیں۔

● مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۵/۹۹ = رسول کے ذمہ صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے ـــ پس یہ چیز نکھر کر عیاں ہو چکی، کہ اطیعوا الرسول کا معنی یہ ہے کہ ہمارے پیغام کی اطاعت کرو، جو ہم نے اپنے پیغام پہنچانے والے کے ذریعہ بھیجا ہے! مع اِس حقیقت کے پیشِ نظر کہ حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے ۶/۵۷ + ۱۲/۴۰ - اور وہ اپنا حکم اپنے رسولوں ہی کے ذریعہ پہنچاتا ہے، خود سامنے نہیں آتا۔ تو پورے جملہ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کا معنی ثابت ہوا کہ: "اللہ کی اطاعت کرو۔ یعنی اُسکے حکم کی اطاعت کرو جو اُس نے رسولِ عربی کے ذریعہ تمہاری طرف نازل فرمایا ہے"۔ پس اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کی درمیانی واؤ مغایرت کی نہیں، بلکہ تفسیری ہے۔ (واؤ تفسیری کی وضاحت حروف کی بحث میں

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۵۹ | تعمیل صورت کا اعلان خود آنحضور کی زبان سے کرا دیا گیا ہے۔ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۶/۵۰ + ۴۶/۹ = میں صرف اور صرف اُس (کتاب) کی اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔ (حاشیہ صفحہ ۱) علاوہ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا معنی قرآنی لغت کے مطابق اللہ کے سوا بھی ہے۔ اور اللہ کے ساتھ بھی ہے تفصیل، حروف کی بحث میں آگے آ رہی ہے۔

آگئے آرہی ہے) — فلہذا جملہ زیرِ بحث میں ایک ہی اطاعت کا حکم ہے۔ الگ الگ دو اطاعتوں کا حکم نہیں۔ بالفاظِ دیگر خدا تعالیٰ نے خود ہی رسولِ مقبول کو اپنے حکم میں شریک ٹھہرا کر خود ہی معاذ اللہ شرک فی الحکم کی تعلیم نہیں دی۔

مختصر الفاظ میں یوں سمجھئیگا، کہ رسول، یعنی پیغام بر کی اطاعت پیغام کی اطاعت ہوتی ہے۔ اُس کی ذاتی اطاعت ہرگز نہیں ہوتی۔ کیونکہ اصل مطاع خود خدا تعالیٰ ہے شخصی رسول نہیں۔

شخصی رسول کی اطاعت کو قرآن کریم نے **باذن اللہ** کی قید میں مقید کر دیا ہوا ہے۔ دیکھئے ارشادِ باری:-

● وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۴/۶۴ = اور نہیں بھیجا ہم نے کوئی رسول، مگر اسلئے کہ اُسکی اطاعت، اللہ کے حکمنامہ اُسکی کتاب کے ذریعہ کی جائے۔ دیکھئے! اگر رسول کی شخصیت ہی مطاع ہوتی تو اذنِ اللہ کی قید نہ لگائی جاتی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ کا اذن کیا ہے جس نے رسولِ مقبول کو مطاع بنا دیا تھا۔ اِذن کا ایک معنیٰ ہے قانون جس کی وضاحت عنوان ۲۵/۴ میں گزر چکی ہے۔ یہاں اللہ کا اِذن وہ خداوندی حکمنامہ قرآن کریم ہے جس کی آمد سے پہلے حضورؐ مطاع نہیں تھے۔ اور جس کے نزول پر اُسکے ذریعہ مطاع ہو گئے، نیز آپ کی پیغام رسانی اس حد تک صداقت و امانت پر مبنی تھی کہ خدا تعالیٰ نے اعلانِ عام کر رکھا ہے کہ میرا رسول میرے پیغام میں ہرگز ہرگز کمی بیشی نہیں کرتا۔ میرے پیغام کے نام سے جو کچھ پیش کرتا ہے، وہ وہی کچھ ہوتا ہے جو اُسکی طرف وحی کیا جاتا ہے:- مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ○ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ○ ۵۳/۴ = وہ (ہمارا رسول، ہمارے پیغام کے سلسلے میں) اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ (بلکہ جسے وحی کے نام سے پیش کرتا ہے) وہ وحی ہی ہوتی ہے، جو اُسکی طرف وحی کی جاتی ہے — سورۂ نساء میں اِس عنوان کی یوں وضاحت کر دی گئی ہے، کہ جس نے رسول کی، (یعنی ہمارے رسول کے ذریعہ ہمارے بھیجے ہوئے ضابطے کی)، اطاعت کی، بیشک اُس نے اللہ ہی کی اطاعت کی:-

● مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۴/۸۰

پھر سُن لیجئیگا! کہ رسالت یعنی پیغام کی اطاعت ہی بیک وقت اللہ کی اطاعت بھی ہوتی ہے اور پیغام لانیوالے کی بھی۔ پس اِس آیتِ مجیدہ میں بھی اطاعتِ واحدہ ہی کی خبر دی گئی ہے۔ اللہ اور رسول کی الگ الگ دو اطاعتوں کی دلیل نہیں لائی گئی۔ پس اسلام اطاعتِ واحدہ کا علمبردار ہے۔ اور اطاعتِ واحدہ صرف خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے۔ جو اُسکے حکمنامہ کے ذریعہ ہوگی جسے رسولِ امین لائے اور بالکم و کاست پہنچا دیا، اور خود بھی اُسی کے مطیع و فرمانبردار رہے۔ مزید برآں قرآن کریم نے اللہ و رسول کیلئے ضمیرِ واحد لا کر بھی واضح کر دیا ہے کہ جملہ "اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ" میں قرآن اور روایات کی دو الگ الگ اطاعتوں کا حکم نہیں دیا گیا۔ بلکہ قرآن کریم کی اکلوتی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ دیکھئے ارشادِ باری:-

۲۶/۴ - اکلوتی اطاعت

● يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَوَلَّوْا عَنْهُ ۸/۲۰ = ایمان والو! اللہ کی، یعنی اُسکے رسول کے لائے ہوئے حکمنامہ کی اطاعت کرو! اور اس (اکلوتے حکمنامے کی)

اگلوتی اطاعت سے روگردانی نہ کرنا — دیکھیئے گا! اگر اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ میں قرآن اور روایات کی الگ الگ دو اطاعتوں کا حکم دیا گیا ہوتا تو ضمیر تثنیہ کی صورت میں "وَلَا تَوَلَّوۡا عَنۡهُمَا" آنا چاہیئے تھا۔ "وَلَا تَوَلَّوۡا عَنۡهُ" کی ضمیر واحد ڈنکے کی چوٹ اعلان کر رہی ہے کہ خدا تعالیٰ کی اکیلی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی لَا یُشۡرِكُ فِیۡ حُكۡمِهٖۤ اَحَدًا ۱۸/۲۶ کی خبر دینے کے بعد، خود ہی رسولِ مقبول کو اپنے حکم میں شریک ٹھہرا کر نہ شرک فی الحکم لازم کر دیا ہے۔ اور نہ تضاد بیانی فرمائی ہے۔

۲۶/۵ - مرکزی اتھارٹی

قرآن کریم کی بعض آیات کریمات سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ کا جملہ اصطلاح کے طور پر اس قرآنی نظام اور مرکزی اتھارٹی کیلئے بھی لایا گیا ہے۔ جسے رسولِ مقبول نے قرآنی آئین کی بنیادوں پر قائم کیا تھا۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:۔

● یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡكُمۡ ۚ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡهُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ كُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ۝ ۴/۵۹

(مفہوم) ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو۔ نیز رسول اور اپنے میں سے اصحاب امر کی اطاعت کرو۔ پھر اگر اصحاب امر کیساتھ تمہارا کوئی تنازعہ ہو جائے۔ تو اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو اس تنازعے کو اللہ اور رسول کی طرف پھیر لاؤ۔ یہی امر بہتر، اور انجام کی رُو سے بہت ہی اچھا ہے۔

دیکھئے! اس آیت مجیدہ میں اپنے میں سے مقرر کردہ اصحاب امر کی اطاعت کا حکم بھی دیا ہے۔ اور اُنکے ساتھ اختلاف و تنازعہ کی اجازت بھی عطا فرمائی ہے۔ اور تنازعہ کی صورت میں متنازعہ امر کو اللہ اور رسول کی طرف پھیر لانے کا حکم دیا ہے۔

اب یہاں پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ کون اصحاب امر ہیں، جن کے حکم یا فیصلے کو چیلنج کرنے کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ کہ ہم کھلے بندوں کہہ سکتے ہیں کہ ہمیں تمہارا فیصلہ منظور نہیں۔ اور اُنکے حکم سے سرتابی کرنے میں ایمان پر آنچ تک نہیں آتی — اور دوسرا سوال یہ ہے کہ آنحضورؐ کی وفات کے بعد جب آپؐ موجود نہیں ہیں۔ تو متنازعہ امر کو کس کی طرف پھیر لیجانے کا حکم دیا گیا ہے۔ جو فیصلہ دیگا اور اختلاف و تنازعہ یکسر ختم ہو جائیگا۔ یعنی جسے خدا تعالیٰ نے ذٰلِكَ خَیۡرٌ وَّاَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ۝ کے الفاظ میں بہتر اور انجام کی رُو سے احسن قرار دیا ہے۔ اس ضمن میں:۔

روایاتی تفاسیر کا کہنا ہے کہ متنازعہ امر کو قرآن اور حدیث کی طرف لے جاؤ۔ لیکن مسلمانوں کی شکلی فرقہ بندی گواہ ہے کہ اہل روایات کے اس تصوّر کے مطابق قرآن و حدیث نے اُمت کے چھوٹے بڑے کسی بھی متنازعہ امر کا فیصلہ نہیں دیا۔ اور اُمت فرقوں میں بٹتی چلی گئی ہے۔ ہر فرقے کا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن اور حدیث اُسی کے حق میں فیصلہ دیتے ہیں۔ فلہذا ثابت ہوا کہ جس تصوّر نے اُمت کو متحد کرنے کی بجائے منتشر و مختلف کر دیا ہے نہ یہ خَیۡرٌ ہو سکتا ہے اور نہ اَحۡسَنُ تَاۡوِیۡلًا ہی قرار دیا جا

سکتا ہے۔ فلہٰذا روایات کا دیا ہوا یہ تصوّر مطلقاً غلط ہے۔

۲۶/۶ - اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کون ہیں؟

اب آئیے حقیقتِ حال کی طرف، آیتِ مجیدہ نے اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کی اطاعت کا حکم دینے کے بعد، جو اُن سے اختلاف و تنازعہ کی اجازت بھی دیدی ہے۔ اِس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ ماتحت عدالتوں کے قاضی یا مجسٹریٹ ہیں، جو قرآنی نظام کی مرکزی اتھارٹی کی طرف سے مقدّمات کی سماعت کیلئے متعیّن کئے جاتے ہیں۔ اور یہ اطاعت دینی امور کی نہیں، کیونکہ دین کے کسی حکم کو چیلنج کیا ہی نہیں جا سکتا۔ بلکہ یہ عوام کے معاشرتی جھگڑوں کا ذکر ہے۔ عوام اپنے تنازعات مرکز کے مقرر کردہ قاضی اور مجسٹریٹوں کے پاس لے جائینگے۔ اب اگر اُن سے کوئی فیصلہ غلط صادر ہو جائے تو جس فرد یا جماعت کی دادرسی نہیں ہوئی۔ وہ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کے فیصلے کو اپیل کے ذریعہ چیلنج کرنے کا مجاز ہے۔ اِسی سلسلے میں آیتِ مجیدہ ۴/۵۹ میں حکم دیا گیا ہے کہ تنازعہ امر کو اپیل کے ذریعے (فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ) اللہ و رسولؐ یعنی مرکزی اتھارٹی کی طرف لوٹا کرلے جاؤ، تاکہ دوبارہ غور و خوض کے بعد، آخری فیصلہ دیدیا جائے، جس کی اپیل نہیں ہو سکیگی۔ پس اللہ و رسولؐ وہ آخری اتھارٹی ہے کہ جس کے فیصلے کی کوئی اپیل نہیں۔ جبتک آنحضور سلامٌ علیہ خود زندہ رہے، آپ آخری اتھارٹی تھے۔ اور آپکے بعد آپکے جانشین آخری اتھارٹی رہے، جن کے فیصلے آخری ہوتے تھے ـــ مقدّمات کے فیصلوں کیلئے اِسی انداز کو قیامت تک کیلئے خَیْرٌ بھی کہا گیا ہے "اور اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا" بھی۔ لیکن یاد رہے کہ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کی پاکیزہ اصطلاح کے ماتحت وہ نظام آ سکتا ہے، جس میں اقتدارِ اعلیٰ خدا تعالیٰ کا تسلیم کیا جاتا ہو۔ فیصلے قرآنی آئین کے مطابق ہوں۔ اور جہاں رشوت اور سفارش راہ نہ پا سکتی ہو ـــ یعنی جو نظام اللہ کے بھیجے ہوئے، اور رسولِ مقبولؐ کے لائے ہوئے ضابطۂ حیات قرآنِ کریم کی بنیادوں پر قائم ہوگا۔ وہ اِس پاکیزہ اصطلاح کا مصداق ہو سکتا ہے۔ نہ نظامِ ملوکیت اس میں داخل ہو سکتا ہے، اور نہ سرمایہ دارانہ نظام، جن میں اللہ و رسولؐ کے اوّلین سبق، درسِ ربوبیّت ہی کی مخالفت موجود ہو۔ حکّام عیش اُڑا رہے ہوں۔ اور عوام ضروریاتِ زندگی سے محروم پائے جاتے ہوں۔

پس یہ اصطلاح ہموار و متوازن قرآنی نظام کی مرکزی اتھارٹی کے سوا کسی اور نظام کیلئے ہرگز استعمال نہیں کی جا سکتی ـــ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ سے مُراد، قرآنی مرکز کی طرف سے متعیّن کردہ قاضی، مجسٹریٹ، حلقہ کے چیئرمین ہیں جو الگ الگ ایک ایک حلقہ، یونٹ یا وارڈ میں عوام کے فیصلوں کیلئے متعیّن کئے جائینگے۔ اللہ و رسولؐ کے الفاظ، انہیں متعیّن کرنیوالی مرکزی اتھارٹی کیلئے اصطلاحاً استعمال کئے گئے ہیں۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں متعدّد مقامات پر اِس نظام کیلئے اصطلاح کے طور پر اللہ اور رسولؐ کے الفاظ لا کر اُن کیلئے ضمیریں بھی واحد لائی گئی ہیں:۔

● يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ لِيُرْضُوْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ اِنْ كَانُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝ ۹/۶۲

دیکھئے! یہاں اللہ اور رسولؐ کیلئے ضمیر تثنیہ نہیں، بلکہ یُرْضُوْهُ میں ہٗ ضمیر واحد لائی گئی ہے۔ اور آیتِ مجیدہ کا مفہوم یہ

ایمان والو! منافق لوگ، تمہیں راضی کرنے کیلئے اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں، حالانکہ اللہ اور رسول زیادہ حقدار ہے کہ اگر وہ مومن ہیں تو اُس ایک کو راضی رکھیں یعنی قرآنی نظام کے وفادار رہیں۔ اب بات صاف ہے کہ اللہ اور رسول کیلئے ضمیر واحد آئی ہے لیکن اللہ اور رسول ایک نہیں۔ اللہ، اللہ ہے اور رسول، رسول ہے پیغام دینے والا اور پیغام پانیوالا ایک نہیں ہو سکتے۔ خالق اور مخلوق ایک نہیں ہیں پس اللہ اور رسول کیلئے واحد ضمیریں لاکر انہیں ایک ٹھہرانے سے صاف ظاہر ہے کہ جملہ اللہ اور رسول اصطلاح کے طور پر کسی ایسی چیز کیلئے لایا گیا ہے جو ایک ہے دو نہیں ـــــ اسکی وضاحت واحد ضمیر لاکر آیتِ ذیل میں بھی کر دی گئی ہے کہ یہ اصطلاح اُس ہموار و متوازن نظام کیلئے استعمال کی گئی ہے جو عوام کی ضروریاتِ زندگی کا ضامن ہو کر انہیں غمِ معاش سے بے نیاز کر دیتا ہے :-

● اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ۹/۷۴ ۔ انہیں اللہ اور رسول نے اپنے فضل (بیت المال) سے غنی کر دیا یعنی اُس واحد مرکزی نظام نے، جو اللہ کے رسول نے اللہ کے حکم کے مطابق قائم کیا ہے، اُن کی ضروریاتِ زندگی کا ضامن بنکر انہیں معاشی غم و فکر سے آزاد کر دیا ہے۔

فلہٰذا ترجمہ اور تفسیر زیرِ نظر میں اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کا معنی ہر مقام پر سیاق و سباق کے مطابق کہیں تو اللہ تعالیٰ کے مقدس رسول سلام علیہ کے لائے ہوئے ضابطۂ خداوندی قرآنِ کریم کی اطاعت مراد لیا گیا ہے اور کہیں اُس ہموار و متوازن مرکزی نظام کی اطاعت، جو آنحضورؐ نے قرآنی خطوط کے مطابق متشکل فرمایا تھا۔ اور جو بلا تمیز اعلیٰ و ادنیٰ پورے عوام کی ضروریاتِ زندگی کا ضامن تھا۔ بالفاظِ دیگر قرآنِ کریم نے، ربوبیتِ عامہ کی بنیادوں پر قائم کردہ اُس ہموار و متوازن نظام کے لئے "اللہ و رسول" کے جملہ کو بطور اصطلاح استعمال کیا ہے، جس میں نہ کوئی بھوکا ہو نہ ننگا، نہ بے مکان ہو نہ بے علاج ۲۰/۱۱۸-۱۱۹ نیز زیرِ نظر ترجمہ میں اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ کے ترجمہ سے اللہ اور رسول کی دو الگ الگ اطاعتوں کا تصور ہرگز نہیں دیا گیا۔ جس سے قرآنِ کریم میں تضاد ثابت ہوتا ہو کہ خدا تعالیٰ نے ۹/۵۷ اور ۱۲/۴۰ میں خود ہی ارشاد فرمایا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی واجب الاطاعت ہے ہی نہیں۔ اور خود ہی رسول مقبول کو اپنی اطاعت میں شریک کرنے کا مشترکہ حکم بھی دے رکھا ہے۔ العیاذ باللہ تعالیٰ۔

۲۷- ناسخ و منسوخ

سابقہ تفاسیر و تراجم میں قرآنِ کریم کے متعلق یہ تصوّر دیا گیا ہے کہ اسکی کچھ آئتیں منسوخ بھی ہو چکی ہیں۔ حتیٰ کہ بعض کے نزدیک پانچ سَو آیاتِ کریمات منسوخ ہیں۔ اور بعض کے نزدیک الگ الگ تین سَو، دو سَو، پچاس اور شاہ ولی اللہ رحمت اللہ علیہ کے نزدیک صرف پانچ منسوخ ہیں۔

لیکن یاد رہے کہ کتابِ خداوندی کی کسی ایک آئت کو بھی منسوخ تسلیم کرنے سے ناموسِ باری محفوظ نہیں رہتی۔ یعنی یہ تصوّر سامنے آتا ہے کہ معاذ اللہ معاذ اللہ بعض حکم نازل کرتے وقت خدا تعالیٰ کو معلوم نہیں ہوتا تھا کہ یہ وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکیگا۔ اور کل کو واپس لینا پڑ جائیگا۔ یہ تصوّر اُس ذاتِ مقدس کے متعلق کس طرح قابلِ قبول ہو سکتا ہے، جو علیم بذات الصدور ہونے کیساتھ ساتھ ہر قسم کے عیوب نقائص سے پاک ہے۔

۲۷/۱- خدا تعالیٰ کے جملہ احکام وقت کے تقاضوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں

خدائے علیم و خبیر کے کلام کی جامعیّت و ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ جملہ احکام میں وقتی تقاضوں کی تبدیلی کا سوال پیدا ہو نیوالا ہوتا ہے۔ انکی وضاحت آئت متعلقہ میں ساتھ کے ساتھ کر دیگئی ہے۔ مثلاً:- ● وضو کا حکم سورہ مائدہ کی آئت ۵/۶ میں درج ہے لیکن اسی آئت میں وضاحت کر دیگئی ہے کہ اگر ایسا وقت آجائے کہ تم سفر میں ہو اور پانی نہیں ملتا، یا اگر تم بیمار ہو، اور پانی موجود تو ہے لیکن پانی کیساتھ وضو کرنا وقتی حالات کے مطابق مضرِ صحت ہے تو تیمم کر لیا کرو۔ اسی طرح:-

● نماز کے متعلق سورہ نساء کی آئت ۴/۱۰۳ میں حکم دیا گیا ہے، کہ اسے مقررہ اوقات میں ادا کرنا فرض ہے:-

● اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ○ ۴/۱۰۳

لیکن یاد رہے کہ نماز کا حکم بعد میں دیا گیا ہے اور اسکے متعلق بدلتے ہوئے حالات کے وقتی تقاضوں کی وضاحت پہلے کر دی ہے، اور خدائے علیم و خبیر کی شان بھی یہی ہو سکتی ہے کہ اُسکے احکام میں، وقتی تقاضوں میں سے کسی ایک کی وضاحت و صراحت کو بھی نظر انداز نہ کیا گیا ہو۔ چنانچہ سورہ نساء کی آیاتِ مجیدہ ۴/۱۰۱-۱۰۲ میں تشریح کر دیگئی ہے کہ اگر تم میدانِ جنگ میں ہو، ابھی لڑائی شروع نہیں ہوئی، نماز باجماعت ادا کرنا اگرچہ ممکن ہے لیکن اگر پورا لشکر ایک ہی مرتبہ نماز میں کھڑا ہو جائے تو خطرہ ہے کہ دشمن یکبارگی حملہ نہ کر دے۔ لہٰذا اس وقتی تقاضے کے مطابق حکم ہوتا ہے کہ نماز کو کم کر لیا کرو:-

● وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِی الْاَرْضِ فَلَیْسَ عَلَیْکُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوۃِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ یَّفْتِنَکُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا اِنَّ الْکٰفِرِیْنَ کَانُوْا لَکُمْ عَدُوًّا مُّبِیْنًا ○ ۴/۱۰۱ —— اس سے اگلی آئت مجیدہ میں حکم دیا گیا ہے کہ آدھی آدھی فوج

باری باری کیساتھ، اس طرح قصر نماز ادا کرلیا کرے۔ کہ ایک گروہ سالار لشکر کیساتھ باجماعت نماز ادا کر رہا ہو۔ اور دوسرا پہرہ دے رہا ہو۔

● وَإِذَا كُنتَ فِيهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلَاةَ فَلْتَقُمْ طَائِفَةٌ مِّنْهُم مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوا أَسْلِحَتَهُمْ فَإِذَا سَجَدُوا فَلْيَكُونُوا مِن وَرَائِكُمْ وَلْتَأْتِ طَائِفَةٌ أُخْرَىٰ لَمْ يُصَلُّوا فَلْيُصَلُّوا مَعَكَ ۴/۱۰۲ = اور اے رسول! جب آپ خود ان میں موجود ہوں تو امام صلوٰۃ کے فرائض آپ خود انجام فرمائیں۔ پس چاہیئے کہ مجاہدوں کا ایک گروہ آپکے ساتھ قیام صلوٰۃ میں کھڑا ہو جائے (اور دوسرا گروہ پہرہ دیتا رہے) پھر جب وہ (پہلا گروہ) سجدہ ذکر کے ایک رکعت پوری کر چکے تو چاہیئے کہ وہ تمہارے پیچھے (پہرہ پر) چلا جائے۔ اور دوسرا گروہ آجائے، جس نے صلوٰۃ ادا نہیں کی۔ اے رسول! وہ بھی آپکے ساتھ صلوٰۃ ادا کرلے۔

یہ تو ہوا اُس وقتی تقاضے کے متعلق حکم، کہ جب ابھی لڑائی شروع نہ ہوئی ہو۔ اور جب لڑائی شروع ہو جائے تو اُس وقت کے متعلق حکم ہوتا ہے۔ کہ اگر اسکے دوران صلوٰۃ کا وقت آجائے تو ہر مجاہد جس حالت میں بھی ہو، کھڑے، بیٹھے یا لیٹے الگ الگ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرلیا کرے۔

● فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلَاةَ فَاذْكُرُوا اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِكُمْ ۴/۱۰۳ = پھر جب تم مذکورہ تقاضوں والی صلوٰۃ پوری کر چکو (اور لڑائی شروع ہو جائے۔ تو اسکے دوران اگر صلوٰۃ کا وقت آجائے) تو پھر صرف اللہ کا ذکر کرلیا کرو، کھڑے بیٹھے اور لیٹے (جس پوزیشن میں بھی ہو) ــــ اور اسکے بعد جب جنگ اور خطرۂ فتنۂ کفار ختم ہو جائے تو ایسے وقت کے لئے حکم ہوتا ہے:۔ ● فَإِذَا اطْمَأْنَنتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ ۴/۱۰۳ = پھر جب تمہیں اطمینان ہو جائے (کہ دشمن کا خطرہ نہیں رہا) تو پورے آداب و شرائط کیساتھ پوری نماز ادا کیا کرو۔ اور اس طرح بدلتے ہوئے حالات سے متعلقہ ہدایات دے چکنے کے بعد ارشاد ہوا ہے:۔

● إِنَّ الصَّلَاةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ كِتَابًا مَّوْقُوتًا ۝ ۴/۱۰۳ = یہ اتنے تکلف کا حکم اسلئے دیا گیا ہے کہ فرضیت نماز، مقررہ اوقات کی حدود میں محدود ہے۔ وقتوں کی پابندی ہر آن فرض ہے۔

● اسی طرح سورہ بقرہ کی آیت نمبر ۲۳۹ میں نماز ہی کے وقتی تقاضوں میں سے ایک ایسے وقت کیلئے حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم سفر میں ہو۔ نماز کا وقت ہے۔ لیکن اگر تم پورے قرآنی حدود و قیود کیساتھ نماز ادا کرو، تو کسی وقتی خطرے کا خوف لاحق ہوتا ہے تو ایسا کیا کرو، کہ اگر سواری پر ہو تو سواری پر ہی نماز ادا کرلیا کرو۔ اور اگر پیدل سفر کر رہے ہو تو پیدل چلتے چلتے نماز ادا کرلیا کرو۔ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا ۲/۲۳۹

دیکھا آپنے کہ خدائے علیم و خبیر، بدلتے ہوئے حالات کے وقتی تقاضوں سے کس طرح باخبر ہے۔ اور اُس نے کس وضاحت و صراحت کیساتھ نماز کے متعلقہ احکام میں وقتی تقاضوں کی ایک ایک شق کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے۔ کہ پانی نہ ہو یا مرض ہو تو تیمم کرلیا کرو۔ جنگ میں ہو تو ایک ایک گروہ باری باری سے، دوسرے گروہ کے پہرے میں نماز ادا کرلیا کرے۔ جنگ شروع

ہو تو ہر مجاہد جس پوزیشن میں ہو اسی پوزیشن میں صلوٰۃ ادا کرلے۔ سفر میں ہو اور کوئی خطرہ لاحق ہو جائے تو پیادہ پا یا سواری پر چلتے چلتے نماز ادا کرلیا کرو۔

اب بتائیے گا کہ ایسی ذاتِ علیم و علّام کے متعلق، کیا ایسا تصوّر بھی کیا جاسکتا ہے کہ اُس نے کبھی بھی کوئی ایسا حکم نازل فرمایا ہو جو وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکتا ہو۔ اور اُسے واپس لینا پڑ گیا ہو۔ یعنی پہلے حکم کو دوسرے حکم کیساتھ منسوخ کرنا پڑ گیا ہو؟

۲۷ تنسیخ آیات کے متعلق قرآنی فیصلہ

تنسیخ آیات کا تصوّر سورہ بقرہ کی آیت ذیل سے لیا جاتا ہے۔

● مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا ۗ أَلَمْ تَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ○ ۲/۱۰۶ (مروجہ ترجمہ) = جو ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے یا اُسے بھلا دیتے ہیں، تو اُس سے بہتر یا اُس جیسی آیت لاتے ہیں۔ کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اِس ترجمے پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی ہی آیتوں میں سے بعض کو منسوخ کر دیتا ہے، تو اُن سے بہتر لانا تو بھلا ایک بات ہوئی، جو اگرچہ خدا تعالیٰ کے شایانِ شان نہیں کہ ایسی آیت نازل ہی کیوں فرمائی جو واپس لینی پڑی، پہلے ہی بہتر آیت کیوں نہ نازل کر دی لیکن دوبارہ بھی پھر اُس جیسی، مِثْلِهَا نازل کرنے کا کیا فائدہ؟ اور اگر دوبارہ اُس جیسی ہی نازل کرنی تھی تو پہلی کے منسوخ کرنے کا کیا مطلب؟

برادرانِ عزیز! خداوند تعالیٰ ایسے عبث افعال کے تصوّر تک سے پاک و منزّہ ہے کہ پہلے تو کوئی ایسی آیت نازل کردے جو وقت کے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکے، اور اُسے واپس لینا پڑ جائے۔ اور پھر دوبارہ نازل کرتے وقت، یا تو اُس سے بہتر آیت نازل کرے اور یا پھر اُسی جیسی نازل کردے جو پہلی کی مانند وقتی تقاضوں کیساتھ نہ چل سکے۔

اب آیئے حقیقتِ حال کی طرف! واضح رہے کہ مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ میں، آيَةٍ کی تنوین عوض مضاف الیہ ہے لیکن اسکا مضاف الیہ اللہ تعالیٰ نہیں ہے۔ کہ اُسکے متعلق اپنی ہی نازل کردہ آیتوں کو منسوخ کرنے کا تصوّر پیدا ہونے لگے۔ اور نہ وہ دوبارہ اُنہی جیسی قابلِ منسوخ آیتیں (مِثْلِهَا) لانے کے فعلِ عبث کا مرتکب ہوتا ہے۔ لیکن ہماری اس تحقیق پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو منسوخ نہیں کرتا۔ تو پھر کس چیز کو منسوخ کرتا ہے۔ کیونکہ "مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ" کے الفاظ سے مطلقاً عدمِ نسخ کا تصوّر تو لیا ہی نہیں جاسکتا۔ اِس سوال کا جواب سورہ حج کی آیت ذیل میں ملاحظہ فرمائیں۔ دیکھئے کیا ارشاد ہوتا ہے:-

● وَمَا أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّىٰ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ○ ۲۲/۵۲

(مفہوم) صاحبِ قرآن! آپ سے پہلے ہم نے کوئی نبی رسول نہیں بھیجا کہ اُسکے ساتھ ایسا نہ ہوا ہو کہ جب وہ کتاب اللہ کی

تلاوت کرتا (یعنی لوگوں کو ہمارا پیغام پہنچاتا)، تو شیطان اُسکے پہنچائے ہوئے پیغاموں میں کچھ اپنی طرف سے پیش کر دیتا۔ پھر اللہ تعالیٰ اُس چیز کو منسوخ کرتا ہے جو شیطان پیش کرتا ہے۔ اِسکے بعد اپنی آیتوں کو محکم کر دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صاحبِ علم و حکمت ہے۔ (یعنی وہ بے علم و حکمت نہیں کہ ایسی آیتیں نازل کرے جو وقت کے بدلتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ نہ دے سکیں اور پھر اُنہیں منسوخ کرکے واپس لینا پڑے)۔

دیکھئیگا! اِس آیتِ مجیدہ میں ایک مستقل اصول بیان کر دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی آیتوں کو محکم کرتا ہے منسوخ نہیں کرتا۔ منسوخ اُس چیز کو کرتا ہے، جو شیطان پیش کرتا ہے ——— فلہذا ثابت ہُوا کہ آیتِ مجیدہ ۲/۱۰۶ میں آیۃ کی تنوین سے "اٰیٰتُ الشَّیْطٰنِ" مراد ہے آیتُ اللہ مُراد نہیں۔ پس ۲/۱۰۶ میں جس چیز کی تنسیخ کی خبر دی گئی ہے اُسی چیز کو ۲۲/۵۲ میں مَا یُلْقِی الشَّیْطٰنُ فرمایا ہے۔ اور اپنی آیتوں کے متعلق یُحْکِمُ اللّٰهُ اٰیٰتِهٖ کی خبر دی گئی ہے۔ جس سے آیاتُ اللہ کی تنسیخ کا تصوّر تک پیدا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ الفاظ استحکامِ آیاتُ اللہ کی بیّن دلیل ہیں۔

اب ملاحظہ فرمائیں ۲۲/۵۲ کے مستقل اصول کی روشنی میں آیتِ مجیدہ ۲/۱۰۶ کا صحیح قرآنی مفہوم:-

یاد رہے کہ آیتِ مجیدہ ۲/۱۰۶ کا ربط ۲/۱۰۴ کیساتھ ہے۔ اِسلئے یہاں ۲/۱۰۴ ہی سے شروع کیا جاتا ہے۔ دیکھئے ارشاد ہُوا ہے:-

● یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ؕ وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝

۲/۱۰۴ (مفہوم) ایمان والو! تم (ہمارے رسُول کو اپنی طرف متوجّہ کرنے کیلئے) رَاعِنَا نہ کہنا۔ (یہ یہودیوں کی نشانی ہے ۴/۴۶) تم اُنظُرنا کہا کرو۔ اور (جب ہمارا نبی تمہاری طرف متوجہ ہو کر کلام فرمائے تو) سُنا کرو۔ ہمارے حکم کا انکار کرنیوالوں کیلئے دردناک عذاب ہے۔ اب ملاحظہ فرمائیگا کہ سُورہ نساء ۴/۴۶ میں **راعنا** کہنے کو یہودی شیطانوں کی نشانی (آیت) بنایا گیا ہے:-

● مِنَ الَّذِیْنَ هَادُوْا یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَیْنَا وَاسْمَعْ غَیْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَیًّۢا بِاَلْسِنَتِهِمْ ۴/۴۶ = اور یہودیوں میں سے ایسے ہیں۔ جو اللہ کے کلام کو اُسکے اصل مقام سے بدل دیتے ہیں۔ اور (ہمارے رسُول کو) کہتے ہیں کہ ہم نے آپ کی بات سُنی اور انکار کر دیا۔ پس آپ ہماری سُنیے دوسروں کی نہ سُنیے۔ اور زبان کو پیچ دیکر کہتے ہیں رَاعِنَا (یعنی راعینا کہتے ہیں = اے ہمارے چرواہے)

اب غور فرمائیگا! کہ باری تعالیٰ یہودی شیطانوں کی اِس نشانی راعِنا کو منسوخ کرکے اور اِسے بھول جانے کا حکم دیکر محکمیت میں اِس سے بہتر نشانی لائے ہیں **اُنظُرنا**، کہ زبان کے پیچ سے بگاڑ کر اِسکا کوئی توہین آمیز مفہوم لیا ہی نہیں جا سکتا۔ اور مفہوم کے لحاظ سے بالکل اُسکی مثل و مانند ہے یعنی راعنا اور انظرنا مترادف المفہوم الفاظ ہیں۔ راعنا کا معنیٰ ہے ہماری رعایت فرمائیں۔ اور اُنظرنا کا معنیٰ ہے ہماری طرف توجّہ فرمائیں۔ فلہذا اُنظرنا محکمیت کے لحاظ سے

راعنا سے بہتر ہے۔ اور مفہوم کے لحاظ سے مثل و مانند۔ اور مذکورہ آیت مجیدہ ۲/۱۰۴ میں اِس شیطانی نشانی کو منسوخ کرنے کے بعد ۲/۱۰۶ میں باری تعالیٰ نے اپنا یہ مستقل قانون پیش کر دیا ہے :۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ[1] اَوْ[2] نُنْسِهَا[3] نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ[4] اَوْ[5] مِثْلِهَا[6] اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○ ۲/۱۰۶

(مفہوم) نہیں منسوخ کرتے ہم کسی (شیطانی) نشانی کو، یعنی ترک کروا دیتے ہیں۔ تو (محکمیت میں) اُس سے بہتر نشانی لاتے ہیں اور (مفہوم میں) اُس جیسی۔ اے مخاطب! کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے اندازے اور پیمانے مقرر کرنے والا ہے۔ (اس کی کوئی آیت، صحیح اندازوں اور پیمانوں کے خلاف ہوتی ہی نہیں کہ اُسے نازل کرنے کے بعد پھر منسوخ کرنا پڑ جائے)

فلہٰذا اِس ترجمہ اور تفسیر میں ناسخ و منسوخ کے مروّجہ روایاتی تصوّر کا گزر تک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک ایک آیت اپنے مقام پر محکم اور چٹان کی طرح اٹل ہے۔

۲۸۔ شانِ نزول

۲۸/۱۔ قرآن کریم عالمگیر ضابطۂ حیات ہے

قرآن فہمی کی راہ میں بیشمار رکاوٹیں سدِّ سکندری بنکر کھڑی ہوئی ہیں۔ جیسے کہ آپ سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ خود قرآن کی رُو سے تو قرآن کا کوئی شوشہ تک منسوخ نہیں۔ اور اُدھر اِسکی پانچ سو آیات کریمات کو منسوخ قرار دے رکھا ہے۔ اِسی طرح سابقہ تفاسیر میں ایک نظریہ چل رہا ہے **شانِ نزول** کا، کہ یہ آیت فلاں یہودی کے حق میں اتری تھی اور یہ فلاں منافق کے بارے میں۔ یہ آیت فلاں صحابی کی شان میں نازل ہوئی تھی۔ اور یہ اہلِ بیت کے فلاں فردِ محترم کیلئے۔ اور اِس طرح قرآنی احکام کی عمومیت کو، جو قیامت تک کی پوری نوعِ انسانی کیلئے ہے، صرف چند افراد تک محدود کر کے رکھ دیا گیا ہے۔ اِس طرح شانِ نزول کا عقیدہ فہمِ قرآن کی راہ میں وہ سدِّ سکندری بنا ہوا ہے، جو کسی بھی آیت کا مفہوم سمجھنے کیلئے قرآن کریم کی طرف آنے ہی نہیں دیتا۔ اور حالت یہ ہوتی ہے کہ آیت تو لے لی قرآن سے اور شانِ نزول تفسیروں سے ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ اور پھر مزیداری یہ ہے کہ قرآن کریم کے ایک ہی نسخہ کے ایک ہی صفحہ پر ایک ایک آیت کے کئی کئی شانِ نزول باندازِ تشکیک درج ہیں یعنی یقینی بات کوئی نہ ملیگی کہ یہ آیت کس کے حق میں نازل ہوئی تھی۔ مثلاً،

[1] یہاں آیت بمعنی نشانی ہے۔ [2] اَوْ عاطفہ بمعنی واؤ تفسیری بمعنی یعنی ہے۔ اَوْ عاطفہ کی تشریح حروف کی بحث میں آگے آرہی ہے۔ [3] بھلا دینا بمعنی ترک کروا دینا۔ [4] خَيْرٍ مِّنْهَا بمعنی محکمیت میں اُس سے بہتر کہ زبان کے پیچ کے ساتھ راعنا کی طرح بگاڑا نہیں جا سکتا [5] اَوْ عاطفہ واؤ کا فائدہ دیتی ہے بمعنی اور۔ [6] مِثْلِهَا سے مُراد ہے مفہوم میں اُس جیسی۔

۲۸/۲ - شانِ نزول کے باہمی اختلافات آئت مجیدہ وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِہٖٓ ۳۹/۳۳ کے متعلق تفسیر عزیزی، حاشیہ نسخہ قرآنِ کریم مطبوعہ ملک دین محمد اینڈ سنز کے صفحہ ۳، پر لکھا ہے کہ :-

"معالم التنزیل میں ہے جَآءَ بِالصِّدْقِ ابن عباس کی روائت میں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ سُدی کی روائت میں جبریلؑ ہیں۔
اسی طرح مزید لکھا ہے کہ "وَصَدَّقَ بِہٖ" سُدی کے نزدیک ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، اور کلبی کی روائت میں حضرت ابوبکر صدیقؓ"
اب غور فرمائیگا کہ شانِ نزول کے پردے میں ایک ہی جنبشِ قلم کے ساتھ کتنی غیر یقینی باتیں لکھ دی گئی ہیں یعنی "جَآءَ بِالصِّدْقِ" یا آنحضرت کے حق میں نازل ہُوا یا جبریلؑ کے حق میں۔ اور "صَدَّقَ بِہٖ" یا تو آنحضورؐ کے حق میں نازل ہُوا تھا۔ اور یا حضرت صدیقؓ کے حق میں۔

۲۸/۳ حاشیہ تفسیر ثنائی یوں تو آپ کو کوئی بھی تفسیر، جو شانِ نزول کے نظریہ پر لکھی گئی ہو، ایسی نہیں ملیگی، جس میں شانِ نزول کا اختلاف موجود نہ ہو، لیکن ہم آپ کو دَورِ جدید کی مشہور ترین تفسیر کی سیر کراتے ہیں۔ مولوی ثناء اللہ صاحب مرحوم کے مترجم قرآن مجید مرتبہ محمد داؤد صاحب راز مطبوعہ دہلی کے صفحہ ۷۰۰ پر سورہ تحریم کی اولین آئت :-

● یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَۚ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۶۶/۱ کا پہلے نمبر پر تو، مفہوم ہی غلط اور ناموسِ رسالت کے منافی لے لیا ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے معاذ اللہ معاذ اللہ، اللہ تعالیٰ کی حلال فرمودہ کسی چیز کو حرام ٹھہرا لیا تھا اور اسکے بعد شانِ نزول میں جو گُل کھلائے ہیں حاشیہ کے اپنے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیں۔ لکھا ہے :-

"اِس سُورت کی ابتدائی آئتوں کی شانِ نزول میں مفسّروں کے اقوال یہ ہیں (۱) بعض تو کہتے ہیں یہ حضرت ماریہؓ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اُن کو حضورؐ نے اپنے اوپر حرام کر دیا تھا۔ نسائی میں یہ روائت موجود ہے کہ حضرت عائشہؓ اور حفصہؓ کے کہنے سُننے سے ایسا ہُوا تھا۔ آپ نے کفارہ دیکر اپنی قسم توڑی اور اس لونڈی سے ملے جُلے۔ (۲) بالکل صحیح باتؒ یہ ہے کہ حضرت زینب بنت جحش کے گھر میں آپ شہد پیا کرتے تھے ...... اِس بارے میں یہ آئت نازل ہوئی"۔
یہاں پہنچکر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ماریہؓ کا کیا واقعہ ہے، کہ ایک شانِ نزول کے مطابق اُنہیں آنحضورؐ نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا؟ اور شہد کا کیا واقعہ ہے جسے آپنے حرام فرما دیا تھا؟ —— روایات کے اِن تراشیدہ واقعات کی تفصیل مولوی ثناء اللہ صاحب

ؒ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اہلِ روایات کے ہاں جب نسائی شریف میں جو صحاح ستّہ میں داخل ہے یہ لکھا ہے کہ آپؐ نے حضرت ماریہؓ کو حرام کرنے پڑتی تھی۔ تو یہ شہد والی بالکل صحیح بات بتانے والے صاحب کون ہیں؟ کیا امام نسائی سے وُہ زیادہ صحیح بات پر پہنچنے والے تھے؟ تعجب کی بات ہے کہ ایک طرف تو نسائی شریف صحیح ہے اور دوسری طرف اُسکے مندرجات کو یہ کہکر غلط قرار دیا گیا ہے کہ جو بالکل صحیح بات ہے وہ نسائی شریف کے خلاف ہے

کے مذکورہ بالا مترجم قرآن کریم کے صفحہ ۱۰۶۷ کے حاشیے پر بالفاظ ذیل درج ہے :۔

۲۸/۴ حضرت ماریہؓ کا روائتی قصہ

"کہتے ہیں آنحضرت نے ام المومنین حفصہؓ کے گھر میں ماریہؓ اپنے حرم سے صحبت کی حضرت حفصہؓ نے کہا یارسول اللہ! کیا میرے گھر میں میرے بستر پر آپ ایسا کرتے ہیں۔ آپنے فرمایا اب سے ماریہؓ میرے اُوپر حرام ہے۔ اور تو اسکا ذکر عائشہؓ سے نہ کیجیو۔ لیکن حضرت حفصہؓ نے عائشہؓ سے یہ حال کہدیا۔ اُن کو بہت غصہ آیا۔ یہانتک کہ آپنے قسم کھائی کہ اب میں ماریہؓ کے پاس کبھی نہیں جاؤنگا۔ اُسوقت یہ آئت اُتری"

یہ تو ہے آئت مجیدہ یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِیْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ۶۶/۱ کے شان نزول کی تفصیل کہ، معاذ اللہ معاذ اللہ آنحضرت نے گھر میں ایک لونڈی رکھی ہوئی تھی۔ آپکا اُسکے ساتھ مباد بیوی کا تعلق تو تھا لیکن اُسے کوئی گھر نہیں دیا ہوا تھا۔ آپنے حضرت حفصہؓ کے گھر میں اُس بے گھر بیوی کا حق زوجیت ادا کیا۔ لیکن حفصہؓ ناراض ہوگئیں انہیں خوش کرنے کیلئے آپنے اُسے اپنے اوپر حرام کر دیا۔ اور حفصہؓ سے کہا اِس واقعہ کا ذکر عائشہؓ سے نہ کرنا (کیوں ؟) لیکن وہ بازنہ آئی آپ کو غصہ آگیا۔ اور حفصہؓ کا غصہ بچاری بیگناہ ماریہؓ پر نکالا۔ اور قسم کھائی کہ اب ماریہؓ کے جنسی حقوق کبھی ادا نہیں کرونگا۔ اِس پر یہ آئت اُتری کہ اے رسولؐ! تو اپنی بیویوں کو خوش کرنے کیلئے اپنے اوپر اُس چیز کو کیوں حرام کرتا ہے۔ جسے اللہ نے تیرے لئے حلال ٹھہرایا ہے۔ اِس پر حضرت نے قسم توڑی اور مسکینوں کو کھانا کھلا کر کفارہ ادا کیا۔ یہ پورا قصہ محض تراشیدہ ہے۔ آئت مجیدہ ۶۶/۱ کے الفاظ اِسکے حامل نہیں ہیں۔

۲۸/۵ شہد کا روائتی قصہ

اب اِسی آئت مجیدہ کے دُوسرے شان نزول کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں اِسی صفحہ پر لکھا ہے :۔

"بعضوں نے کہا کہ آنحضرتؐ نے اپنی بی بی حضرت زینبؓ کے گھر شہد پیا۔ حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے صلاح کی کہ جب آنحضرت ہمارے پاس آئیں تو ہم یہ کہیں کہ آپکے مُنہ سے گوندکی بُو آتی ہے۔ اور آنحضرتؐ کو اِس سے بڑی نفرت تھی کہ آپکے بدن، لباس یا کپڑے سے کوئی بُری بُو آئے۔ چنانچہ جب آنحضرتؐ اُنکے پاس آئے تو دونوں نے یہی کہا۔ آپنے فرمایا میں نے تو زینبؓ کے پاس شہد پیا تھا۔ اب سے شہد کبھی نہیں پیونگا۔ اُسوقت یہ آئت اُتری۔ بعضوں نے کہا کہ بی بی اُمّ سلمہ کے پاس سفید شہد پیا تھا"

ایک اہم نوٹ

حاشیہ نگار کہتا ہے کہ آنحضورؐ نے شہد، یا تو حضرت زینبؓ کے گھر سے پیا تھا، اور یا حضرت اُمّ سلمہؓ کے گھر سے لیکن بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد سوم کے صفحہ ۱۳۶ پر لکھا ہے کہ آپنے شہد حضرت حفصہؓ کے گھر سے پیا تھا۔

یہ ہے دُوسرے شان نزول کی تفصیل، کہ شہد پلانے والی کہیں حضرت زینبؓ بتائی گئی ہے، کہیں اُمّ سلمہؓ اور کہیں حفصہؓ (الامان والحفیظ) نیز پہلے نمبر پر تو یہ بتایا گیا ہے کہ آنحضورؐ کی دو بیویوں نے ایک جھوٹ گھڑا، پھر جھوٹ پر ایک دوسری سے تعاون کیا۔ اور اسکے بعد بل کر مجوزہ جھوٹ بولا کہ یارسولؐ اللہ آپکے مُنہ سے بُو آتی ہے۔ اِس پر آنحضورؐ نے بلا تحقیق اپنے اوپر شہد حرام

کردیا۔ یہ تو ایک معمولی سطح کا آدمی بھی جانتا ہے کہ ہاتھ کی ہتھیلی پر سانس خارج کرکے سُونگھنے سے پتہ چل جاتا ہے کہ مُنہ سے کس قسم کی بُو آرہی ہے۔

اب بتایئے! کہ اس بالکل صحیح شانِ نزول نے ناموسِ ازواجِ مطہرات کو داغدار تو کیا ہی تھا۔ خود رسول اکرم سلامٌ علیہ کو کس سطح کا انسان ثابت کر دکھایا ہے۔ کہ بلا تحقیق ایک ایسا کام کردیا جس سے آپ پر خدا تعالیٰ کے حلال کو حرام کرنے کی سنگین دفعہ عائد ہوگئی۔ اور ذاتِ باری کو تنبیہ کے طور پر آیت نازل کرنی پڑی کہ :۔

● اے نبی! یعنی ہماری طرف سے خبر پاکر لوگوں کو حلال و حرام کی تمیز دلانے والے؛ تجھے تو عوام کی رہنمائی کیلئے مبعوث کیا گیا ہے۔ تو نے خود ہی اللہ کے حلال کو کیوں حرام کردیا ہے؟ ـــ کیا ایسا تصور جناب خاتم النبییّن سلامٌ علیہ کے متعلق کیا جاسکتا ہے، جن کا اقرار و اعلان خدا تعالیٰ نے اپنی مقدّس کتاب میں قیامت تک کیلئے محفوظ کررکھا ہے :۔ ● اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَیَّ ٦/٥٠ + ١٠/١٥ + ٤٦/٩ = میں تو صرف اور صرف اُسی ضابطے کی اتّباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا گیا ہے ـــ آنحضور کے اس صحیح اور سچّے اعلان کی روشنی میں :۔

۲۸/٦ آیۂ تحریم کا صحیح مفہوم

اب آیۂ مجیدہ ● يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ تَبْتَغِيْ مَرْضَاتَ اَزْوَاجِكَ ٦٦/١ کا صحیح مفہوم ملاحظہ فرمائیں ـ یاد رہے کہ لِمَ تُحَرِّمُ میں استفہام انکاری ہے اور تُحَرِّمُ فعل مضارع مستقبل کیلئے آیا ہے، حال کیلئے نہیں آیا :۔

● اے نبی! تو ایسی چیز کو کیوں حرام کریگا، جو اللہ نے تیرے لئے حلال ٹھہرائی ہے۔ (یعنی تو اللہ کے حلال کو کبھی حرام نہیں ٹھہرائیگا اِس سلسلے میں) تو بیویوں کی خوشنودی کیوں چاہیگا؟ (یعنی تو بیویوں کی خوشنودی کیلئے بھی اللہ کے کسی حلال کو حرام نہیں ٹھہرائیگا)

دیکھا آپنے کہ ان الفاظ میں کس طرح ناموسِ رسالت کو ہمیشہ کیلئے محفوظ کردیا گیا ہے لیکن جو آیت مجیدہ تحفّظ ناموسِ رسول کی ضامن ہے، شانِ نزول کے روایتی نظریہ نے اسی آیت کی مدد سے حضور کے دامنِ عصمت کو اس بُری طرح داغدار کررکھا ہے، کہ قرآنی حلال و حرام کے ضامن سلامٌ علیہ ہی نے اللہ کے حلال کو حرام کردیا تھا۔ العیاذ باللہ!

۲۸/۷ شانِ نزول کا نظریہ خود شانِ باری بھی کے خلاف ہے

سابقہ تفاسیر و تراجم نے تصوّر دیا ہے کہ وضو کا حکم نازل کرنے کے بعد تیمم کا حکم اُسوقت نازل ہوا تھا کہ جب رسولِ اکرم معہ صحابہ، ایک سفر میں تھے۔ قافلہ ایسے مقام پر تھا، جہاں پانی موجود نہیں تھا۔ قافلے کو روانگی کا حکم ہوا۔ چنانچہ کوچ ہونیوالا تھا

---

۱۵ عربی زبان کا عموماً قاعدہ ہے کہ استفہامیہ فقروں میں انکار سے اقرار اور اقرار سے انکار مقصود ہوتا ہے۔ اِسی طرح ٦٦/١ میں جو بصورتِ استفہام ارشاد ہوا ہے کہ تو اُسے کیوں حرام کریگا جسے اللہ نے حلال کیا ہے۔ تو یہ استفہام انکاری ہے۔ اور مفہوم یہ ہے کہ اے نبی! آپ اللہ کے حلال کو کبھی بھی حرام نہیں ٹھہرائینگے۔

کہ حضرتِ عائشہؓ کا ہار گم ہو گیا۔ ہار کی تلاش میں نماز کا وقت تنگ ہو گیا۔ صحابہؓ نے حضرتِ ابوبکرؓ کو طعنے دینے شروع کئے کہ دیکھا تیری بیٹی نے کیا کیا ہے۔ نماز کا وقت جا رہا ہے۔ پانی یہاں ہے نہیں اور اس نے قافلہ کو روک دیا ہے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے بیٹی کے کندھے پر چوکے دیئے۔ اور بہت سخت سُست کہا۔ لیکن اُس نے اسلئے کوئی جواب نہ دیا کیونکہ آنحضورؐ اُسکے زانو پر سر رکھکر سوئے ہوئے تھے۔ حضرتِ عائشہؓ، صحابہؓ رسولؐ اور والد بزرگوار کے طعنوں کو زہر کے گھونٹ کر کے پی گئیں۔ تو اُسوقت تیمم کا حکم نازل ہُوا کہ پانی نہ ہو تو تیمم کر لیا کرو۔ (ملخص بخاری شریف قرآن محل کراچی جلد دوم صفحہ ۷۷)

دیکھا آپنے، یہ ہے آیۂ تیمم کا شانِ نزول، جسمیں ناموسِ رسالت و صحابہؓ کو اس طرح مجروح کیا گیا ہے کہ قافلے بھر میں نماز کے وقت کے ضیاع کی بدولت اضطراب آیا ہُوا ہے۔ اور آپ دورانِ سفر بھی زوجہ محترمہ کے زانو پر سر رکھے آرام فرما رہے ہیں۔ کیا آنحضورؐ کو نماز کے وقت کی فکر نہیں تھی؟ —— دُوسرے نمبر پر اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو صحابۂ رسولؐ کو، زوجۂ رسولؐ کا اتنا بھی احترام نہیں تھا کہ ہار کا گم ہو جانا کوئی خود اختیاری امر نہیں۔ اور تیسرے نمبر پر خود خدا تعالیٰ کو کیا اتنا بھی معلوم نہیں تھا کہ اُمّت پر ایسے وقت بھی آئینگے جہاں وضو کیلئے پانی موجود نہیں ہوگا۔ تیمم کا حکم وضو کے حکم کے ساتھ ہی کیوں نہ نازل کر دیا کہ جہاں پانی نہ ملے تیمم کر کے نماز پڑھ لیا کرنا۔

افسوس ہے کہ روایات نے قرآن کریم سے پوری پوری بے اعتنائی اختیار کر رکھی ہے۔ ورنہ حقیقت حال یہ ہے کہ خدا تعالیٰ نے ایک ہی آیت مجیدہ ۵/۶ میں وضو کے حکم کے عین متصل وضاحت کر دی ہے :- ● وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوْا بِوُجُوْهِكُمْ وَاَيْدِيْكُمْ مِّنْهُ ؕ مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ ۵/۶ = اور اگر (پانی موجود ہے، لیکن) تم بیمار ہو (اور پانی مضر پڑتا ہے)، تم سفر میں ہو۔ یا تم میں سے کوئی جائے ضرور سے آئے۔ یا بیوی سے لمس کرے اور پانی نہ پائے، تو آلائش کو پاکیزہ مٹی کیساتھ صاف کر لیا کرو۔ اور مُنہ اور ہاتھوں سے گرد و غبار پونچھ لیا کرو۔ اللہ تعالیٰ تم پر کسی قسم کی تنگی کا ارادہ ہرگز نہیں کرتا —— آپ دیکھیئگا! کہ قرآن کریم ہر مسئلے کی ضروری شقیں ساتھ کے ساتھ بیان کرتا چلا جاتا ہے۔ مگر روایات میں کہ شانِ نزول کا شاخسانہ کھڑا کر کے یہ تصوّر دے رکھا ہے کہ جب تک کسی آیت کے نزول کیلئے اسباب پیدا نہیں ہوتے تھے، نازل نہیں ہوتی تھی۔

۲۸/۸ ایک ضروری وضاحت

شانِ نزول کے ضمن میں واضح کرنے کی یہ چیز ہے کہ قرآن کریم میں بعض مقامات پر خدا تعالیٰ نے اپنے مقدس رسولؐ پر بعض مسائل کی وضاحت لوگوں کے سوال کرنے سے پہلے ہی اس طرح فرما دی تھی کہ لوگ آپ سے یہ سوال پوچھینگے، آپ یہ جواب دیجئیگا۔ مثلاً ارشاد ہُوا ہے :-

● يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلِ الْعَفْوَ ۲/۲۱۹ = صاحب قرآن: لوگ آپ سے سوال کرینگے کہ وہ کتنا کتنا اللہ کی راہ میں خرچ کرتے چلے جائیں۔ آپ فرما دیجئیگا کہ جتنیں ضرورت سے زائد ہر چیز راہِ خدا میں دے دینی ہوگی۔

• یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ قُلْ هُوَ اَذًى ۲/۲۲۲ = صاحب قرآن! لوگ آپ سے عورتوں کے ماہواری کورس کے متعلق سوال کرینگے۔ آپ فرما دیجئےگا۔ کہ وہ ایک بیماری ہے۔ ان ایام میں ان سے پرہیز کرتے رہنا۔ (وغیرہ وغیرہ)

واضح رہے کہ یَسْئَلُوْنَ فعل مضارع ہے۔ جو عربی زبان میں الگ الگ حال اور استقبال دونوں کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ مروجہ تراجم و تفاسیر نے اسے حال کیلئے مختص کرکے شانِ نزول کا جواز ثابت کیا ہے کہ لوگ جب آپ سے سوال کرتے تھے۔ تو خدا تعالیٰ انکے سوال کو دہرا کر جواب نازل کرتا تھا۔ بالفاظِ دیگر جب سائل سوال کرتا تھا تو معاذ اللہ معاذ اللہ آپ کے پاس کوئی جواب موجود نہیں ہوتا تھا۔ آپ وحی کا انتظار کرتے تھے۔ اور جب وحی آتی، تب جواب دیا کرتے تھے لیکن یہ چیز تو کسی انسان کے متعلق بھی باور نہیں کی جا سکتی کہ وہ کسی کو اپنا نمائندہ بنا کر کسی قوم کی طرف بھیجے لیکن اس قوم کے سوالوں کا جواب اور نمائندگی سے متعلقہ ہدایات دیئے بغیر روانہ کردے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے آخری نمائندہ رسولِ عربی کے متعلق تفاسیر میں لکھا ہے کہ لوگوں نے قصۂ اصحابِ کہف کے متعلق سوال کیا لیکن آنحضورؐ کے پاس جواب موجود نہیں تھا۔ آپ نے فرمایا کل بتاؤنگا۔ خیال یہ تھا کہ جبریلؑ آئینگے اور پوچھ کر بتادونگا لیکن جبریلؑ نہ آئے اٹھارہ دن۔ اور آپؐ معاذ اللہ معاذ اللہ، اٹھارہ دن تک لوگوں کے سامنے ندامت اٹھاتے رہے (دیکھئے حاشیہ موضح القرآن متعلقہ آیات مجید: ۱۸/۲۳-۲۴) اسکے برعکس اللہ تعالیٰ اور اسکے مقدس نمائندہ کی شان کیا ہو سکتی ہے کہ سوال سائل کے منہ میں ہو اور ادھر جواب حاضر و موجود ہو۔ پس اس ٹھوس مسئلہ کی رو سے یَسْئَلُوْنَكَ فعل مضارع سے زمانہ حال مراد نہیں، بلکہ زمانہ استقبال مراد ہے۔ اور قوم کے ہر قسم کے سوالوں کے جوابات حضورؐ کو قبل از وقت ہی عطا کر دیئے گئے تھے کہ اے رسولؐ! لوگ آپ سے یہ سوال کرینگے آپ یہ جواب دینا۔ یہ سوال کرینگے تو یہ جواب دینا۔

المختصر، شانِ نزول کے روایاتی نظریہ کے مطابق چونکہ ناموسِ باری اور ناموسِ رسالت دونوں مجروح ہوتی ہیں اسلئے یہ نظریہ مطلقاً غیر قرآنی، غلط اور زمانہ رسالت سے کہیں بعد کی پیداوار ہے

فلھذا زیرِ نظر ترجمہ اور تفسیر میں روایاتی شانِ نزول کیطرف ہرگز رخ نہیں کیا گیا، بلکہ قرآن کریم کے اپنے بتائے ہوئے مندرجہ بالا اصول و قواعد کے مطابق قرآن کی تفسیر خود قرآن کریم کیساتھ کیگئی ہے۔

۲۹ - حروفِ مقطعات

۲۹/۱ کیا حروفِ مقطعات کا مفہوم، معاذ اللہ معاذ اللہ رسول کریمؐ بھی نہیں جانتے تھے

قرآن کریم کی متعدد سُوَرِ مجیدات کے ابتدا میں الٓمٓ، الٓمٓصٓ کی قسم کے حروف آئے ہیں جن کے متعلق سابقہ تفاسیر و تراجم نے ایک تصور تو یہ دیا ہے:۔ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ مُرَادِہٖ = اسکا معنی اور مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور دوسرا تصور یہ دیا ہے کہ ان کا مفہوم اللہ اور اسکا رسول ہی جانتے ہیں۔ انہوں نے کسی کو بھی نہیں بتایا۔ اول تو یہ نظریہ اس لحاظ سے بھی

محلِ نظر ہیں، کہ اگر ان حروف کا مفہوم پوشیدہ رکھنا ہی منظور تھا تو اِن کے نازل کرنے کا کیا مقصد؟ کیا یہ حروف جنّ کے تعویذوں پر لکھنے کیلئے نازل کیئے گئے تھے؟ العیاذ باللہ ـــــ اِن میں سے پہلا تصوّر انتہائی خطرناک ہے، کہ کیا اِنکا مفہوم رسولِ مقبول بھی نہیں جانتے تھے؟ حالانکہ یہ حروف قرآنِ کریم کا حصّہ ہیں، اور خدا تعالیٰ نے پورے قرآنِ کریم کے متعلق چار مرتبہ کے تکرار کیساتھ اعلان فرمایا ہے:- ● وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ○ $\frac{۵۴}{۱۷-۲۲-۳۲-۴۰}$ = اور بیشک ہم نے پورے قرآن کو نصیحت کیلئے آسان کر دیا ہے۔ ہے کوئی نصیحت حاصل کرنیوالا ــ اِن آیاتِ کریمات میں القرآن کا الف لام استغراقی ہے، اور واضح کر دیا گیا ہے کہ حروفِ مقطّعات سمیت سارے کا سارا قرآنِ کریم آسان اور انسانی فہم و ادراک کے عین مطابق ہے۔

$\frac{۲۹}{۲}$ - حروفِ مقطّعات کیا ہیں؟

تقطیع کا معنی ہے کاٹنا۔ جُدا کرنا۔ لہٰذا مقطّعات اپنے الفاظ سے قطع کردہ حروف ہیں۔ جو اپنے اپنے الفاظ کے قائم مقام کے طور پر ازروئے اختصار آتے ہیں۔ اختصار کا یہ طریقہ ہر زبان میں موجود ہے۔ مثلاً انگریزی میں ڈپٹی کمشنر کیلئے ڈی۔سی، اور ڈویژنل آفیسر کیلئے ڈی۔ او استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ڈی ڈپٹی کا۔ اور سی کمشنر کا قائم مقام ہے۔ اور اسیطرح ڈی ڈویژنل کا اور او آفیسر کا قائم مقام ہے۔ [۳۳]

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا قرآنِ کریم میں قطعِ حروف کی کوئی مثال موجود ہے؟ اِسکے لئے خدا تعالیٰ نے اپنے ایک رسول کا تعارف دو ناموں اِل یاسین اور الیاس سے کرایا ہے۔ اوّل الذکر اُنکا پورا نام ہے۔ اور موخر الذکر قطع کردہ۔ قطعِ حرف کیلئے ذیل کے نقشہ کو بغور ملاحظہ فرمائیں:-

۱- الیاسین = الیا + سین

۲- الیاس = الیا + س ←ــــ قطع کردہ از سین

دیکھئے! اس نقشہ سے بالصّراحت عیاں ہو رہا ہے کہ الیاس کا س، الیاسین کے سین کا پہلا قطع کردہ حرف ہے۔ اربابِ عقل و دانش کیلئے قرآنِ کریم کی یہ مثال حروفِ مقطّعات کو سمجھنے کیلئے کافی ہے کہ وہ اپنے اپنے الفاظ کے قطع کردہ پہلے حروف ہیں، اور اپنے اپنے پورے الفاظ کے قائم مقام ہیں۔

$\frac{۲۹}{۳}$ - روایاتی اور قرآنی تصوّر کا الگ الگ خاکہ

ایک طرف تو روایات یہ تصوّر دیتی ہیں کہ حروفِ مقطّعات کا مفہوم صرف اللہ، یا اللہ اور رسول کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور نہ اُنہوں نے اِنکا کوئی مفہوم بتایا ہی ہے۔ اور دوسری طرف الٓمّ کا یہ مفہوم بتایا بھی جاتا ہے، کہ الف سے اللہ، لام سے جبریل اور م سے محمدؐ مراد ہے۔ کیا خوب کُلیہ اختیار کیا گیا ہے کہ دو لفظوں، اللہ اور محمدؐ کے تو پہلے حروف قطع کر لئے ہیں اور تیسرے لفظ جبریل کا آخری حرف کاٹ لیا ہے۔ اور میم مشدّدہ جو دراصل دو میم ہیں، اُن میں سے ایک میم چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور بعض لوگ الٓمّ کا مفہوم بتاتے ہیں آلِ محمدؐ۔

اب آئیے حقیقتِ حال کی طرف! حروفِ مقطّعات کا مفہوم سمجھنے کیلئے ایک آسان ترین مقطعہ پر غور فرمائیں۔

● یٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ ۙ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ ۳۶/۱تا۳ — یٰس میں یا حرفِ ندا اور سٓ منادیٰ ہے اور اِنَّکَ میں کَ ضمیر واحد مذکّر مخاطب آئی ہے، جو اپنے مرجع کو چاہتی ہے۔ اور یہاں دوپہر کے سورج کیطرح عیاں ہے کہ اس ضمیر کا مرجع سٓ ہی ہے جسے قرآنِ کریم کی شہادت کیساتھ کہا گیا ہے کہ بلاشبہ آپ ہمارے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں — اب بتائیے گا کہ یہ کونسی ذاتِ مقدّس ہے جنہیں نزولِ قرآن کیساتھ شرفِ رسالت عطا ہوا تھا؟ — اب دیکھئے! اس کے جواب میں آپ کی زبان پر بے ساختہ آرہا ہے، حضور صاحب نور کا نامِ نامی محمد رسول اللہ۔ پس یٰسٓ کے بعد آنیوالی کَ ضمیر واحد مخاطب نے ثابت کر دیا کہ سٓ حرفِ مقطعہ جناب محمد رسول اللہ سلام علیہ ہی کیلئے آیا ہے۔ اور یہ حضور کا لقبِ گرامی ہے، جس کے ساتھ خدا تعالیٰ نے آپکو مخاطب کر کے ارشاد فرمایا ہے کہ اے سٓ! آپ بھی ہمارے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں۔

۲۹/۴ سٓ کا مفہوم

سٓ کیا ہے اور یہ کس لفظ کا قطع کردہ حرف ہے؟۔ اسکا جواب اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ کی خداوندی خبر کے مطابق رسولوں کی صفاتِ حمیدہ کی فہرست میں ملیگا۔ حضرت زکریا کو، حضرتِ یحییٰ کی خوشخبری اِن الفاظ میں دی گئی ہے:— ● اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًاۢ بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ ۳/۳۹ = اے زکریا! بلاشبہ، اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے، جو قانونِ الٰہی کا مصدِّق سیّد تحمل مزاج، نبی اور صالحین میں سے ہوگا — اِس آئتِ مجیدہ میں حضرتِ یحییٰ کی پانچ صفتیں بیان ہوئی ہیں۔ جن میں ایک صفت سیّد ہے پس لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۲/۲۸۵ کے مطابق اللہ کے سب رسول معہ آنحضور سیّد ہیں۔ فلہٰذا ثابت ہوا کہ یٰسٓ کا سٓ لفظِ سیّد سے قطع کردہ پہلا حرف ہے۔ اور سیّد آنحضور کا قرآنی لقب گرامی ہے، جو انبیاء سلام علیہم کیلئے مختص ہے۔

۲۹/۵ حروفِ مقطّعات کا قاعدہ کلیہ

حرفِ مقطعہ سٓ کی قرآنی بحث سے حروفِ مقطّعات کے متعلق یہ قاعدہ کلیہ نکھر کر عیاں ہو چکا کہ جملہ حروفِ مقطّعات آنحضور کے القابِ گرامی اور اپنے اپنے الفاظ سے قطع کردہ پہلے حرف ہیں۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم کی ۲۹ سورتوں کی ابتداء میں الگ الگ ذیل کے حروفِ مقطّعات آئے ہیں:—

الٓمٓ سورہ بقرہ، آل عمران، عنکبوت، روم، لقمان اور سجدہ، چھ سورتوں کے شروع میں آئے ہیں۔

الٓمٓصٓ۔ سورہ اعراف کے شروع میں۔ اور الٓرٰ سورہ یونس، ہود، یوسف، ابراہیم اور حجر پانچ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں۔

الٓمٓرٰ سورہ رعد کے شروع میں اور حٰمٓ سورہ مومن، حٰم سجدہ، زخرف، دخان، جاثیہ اور احقاف چھ سورتوں

کی ابتداء میں آئے ہیں۔
طٰسٓ سورہ نمل کے شروع میں۔ اور طٰسٓمّٓ سورہ شعراء اور قصص کی ابتداء میں آئے ہیں۔
طٰہٰ سورہ طٰہٰ اور یٰسٓ سورہ یٰسٓ کے شروع میں، صٓ سورہ صٓ کے شروع میں اور قٓ سورہ قٓ کی ابتداء میں آیا ہے۔
نٓ سورہ قلم کے شروع میں آیا ہے، حٰمٓ عٓسٓقٓ سورہ شوریٰ کی اور کٓھٰیٰعٓصٓ سورہ مریم کی ابتداء میں آئے ہیں۔

جیسے کہ حرف مقطعہ صٓ کی بحث میں ثابت کیا جا چکا ہے کہ جملہ حروفِ مقطعات آنحضورؐ کے القاب گرامی ہیں۔ پس واضح رہے کہ انہیں ہر جگہ پر، یا تو مرجع کی حیثیت حاصل ہے یا ماموُر کی۔ اور ہر مقام پر حروفِ مقطعات کے بعد یا تو آنحضورؐ کیلئے لکَ ضمیر حاضر مخاطب آئی ہے، جس کا مرجع حروفِ مقطعات ہیں، اور یا آپ ہی کو مخاطب کر کے کوئی حکم دیا گیا ہے۔
ذیل میں جملہ حروفِ مقطعات الگ الگ معہ ضمائر مخاطب پیشِ خدمت ہیں :۔

● الٓمّٓ سورہ بقرہ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۲/۴ کے الفاظ میں دو مرتبہ کے تکرار کیساتھ لکَ ضمیر مخاطب میں آنحضور سلامٌ علیہ کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور ان ضمائر کا مرجع الٓمّٓ ہے —— سورہ آل عمران میں نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ ۳/۳ —— سورہ عنکبوت میں وَلَئِنْ جَآءَ نَصْرٌ مِّنْ رَّبِّكَ ۲۹/۱۰ —— سورہ سجدہ میں بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۳۲/۳ —— سورہ روم میں فَاَقِمْ وَجْهَكَ ۳۰/۳۰، الگ الگ لکَ ضمیر مخاطب آنحضورؐ ہی کیلئے آئی ہے —— اور سورہ لقمان میں فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۳۱/۷ کے الفاظ میں آنحضور سلامٌ علیہ ہی کو مخاطب کیا گیا ہےلہ جس سے بالوضاحت ثابت ہوا کہ الٓمّٓ حروفِ مقطعات حضور سلامٌ علیہ ہی کے القاب گرامی ہیں۔ جن کیساتھ آپ کو ان چھ سورتوں کے شروع میں مخاطب کیا گیا ہے۔

● الٓمّٓصٓ سورہ اعراف میں كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ ۷/۲ کے الفاظ میں دو مرتبہ کے تکرار کیساتھ لکَ ضمیر مخاطب میں آنحضورؐ ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور ان ضمائر کا مرجع الٓمّٓصٓ ہے۔

● الٓرٰ کے خطاب سے سورہ یونس میں قُلْ مَا يَكُوْنُ ..... الخ ۱۰/۱۵ کے الفاظ میں آنحضور ہی کو مخاطب

لہ سورہ روم میں الٓمّٓ حروفِ مقطعات کے بعد تیسویں آیت میں لکَ ضمیر مخاطب آئی ہے۔ واقعہ ہے کہ ضمیر کے مرجع سے دور واقع ہونے سے حروفِ مقطعات کی حیثیت پر کوئی مخالف اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ سورہ بقرہ اور آل عمران میں مرجع الٓمّٓ کے عین متصل ضمیر مخاطب موجود ہے :- الٓمّٓ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ۳/۲-۳۔ اسی طرح باقی حروفِ مقطعات کے بعد بھی اگر کہیں ضمیر مخاطب یا قُل کا خطاب ذرا دور وارد ہوا ہو تو اس سے کوئی حرج واقع نہیں ہوتا۔ کیونکہ خدا تعالیٰ نے دوسری جگہ پر انہی مقطعات کے عین متصل ضمیر مخاطب لا کر شک شبہ کی گنجائش کلمۃً ختم کر دی ہوئی ہے۔

کیا گیا ہے ــــ سورہ ہود میں قُلْ محذوف کیساتھ آنحضور ہی کو حکم ہوا ہے کہ اعلان کر دیجیئگا اِنَّنِیْ لَکُمْ مِّنْهُ نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ ۱۱/۲ ــــ سورہ یوسف میں نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ ۱۲/۳ ــــ اور سورہ ابراہیم ۱۴/۱ میں کِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَیْكَ کے الفاظ میں الگ الگ ك ضمیر مخاطب کیساتھ آنحضور ہی کو خطاب کیا گیا ہے ــــ اور سورہ حجر ۱۵/۳ میں ذَرْهُمْ کے فعل امر کیساتھ آنحضور ہی کو حکم دیا گیا ہے کہ مخالفین کو چھوڑ دیجیئگا۔ فلہذا حروف مقطعات الٓرٰ بھی حضور سلام علیہ ہی کے القاب گرامی ہیں جن کیساتھ پانچ سورتوں کے شروع میں آپکو مخاطب کیا گیا ہے۔

● الٓمّٓرٰ کے خطاب سے سورہ رعد میں وَالَّذِیْ اُنْزِلَ اِلَیْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ ۱۳/۱ کے الفاظ میں دو مرتبہ کے تکرار کیساتھ كَ ضمیر مخاطب لاکر آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور ان ضمائر کا مرجع الٓمّٓرٰ ہے۔

● حٰمٓ کے خطاب سے سورہ مومن میں فَلَا یَغْرُرْكَ ۴۰/۴ ــــ سورہ دخان میں رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۴۴/۶ ــــ اور سورہ جاثیہ میں تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ ۴۵/۶ میں الگ الگ كَ ضمیر مخاطب کے ساتھ آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے ــــ سورہ احقاف میں قُلْ اَرَءَیْتُمْ ...... الخ ۴۶/۴ ــــ اور سورہ حم سجدہ میں قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۴۱/۶ ــــ اور سورہ زخرف میں لَئِنْ سَاَلْتَهُمْ ...... الخ ۴۳/۹ کے الفاظ میں آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ جس سے ثابت ہوا کہ حٰمٓ کے حروف مقطعات بھی حضور سلام علیہ کے القاب گرامی ہیں۔ جن کیساتھ آپکو چھ سورتوں کے شروع میں مخاطب کیا گیا ہے۔

● طٰسٓ کے خطاب سے سورہ نمل میں اِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ ...... الخ ۲۷/۶ کے الفاظ میں ك ضمیر واحد مخاطب کیساتھ آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اور اس ضمیر کا مرجع طٰسٓ ہے۔

● طٰسٓمّٓ کے خطاب سے سورہ شعراء لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ ۲۶/۳ کے الفاظ میں دو مرتبہ کے تکرار کیساتھ۔ اور سورہ قصص ۲۸/۳ میں بھی نَتْلُوْا عَلَیْكَ کے الفاظ میں الگ الگ كَ ضمیر مخاطب کے ساتھ آنحضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے جس سے ثابت ہوا کہ طٰسٓمّٓ بھی آنحضور کے القاب گرامی ہیں۔

● طٰهٰ کے خطاب سے سورہ طٰہٰ میں مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۲۰/۲ کے الفاظ میں كَ ضمیر مخاطب کیساتھ حضور ہی کو مخاطب کیا گیا ہے۔

● یٰسٓ کے خطاب سے سورہ یٰسٓ میں اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۳۶/۳ کے الفاظ میں آنحضور ہی کیلئے كَ ضمیر مخاطب آئی ہے۔

● صٓ کے خطاب سے سورہ صٓ میں اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ ۳۸/۹ کے الفاظ میں حضور سلام علیہ ہی کے لئے كَ ضمیر مخاطب آئی ہے۔

● قٓ کے خطاب سے سورہ قٓ میں فَاصْبِرْ عَلٰى مَا یَقُوْلُوْنَ ۵۰/۳۹ میں فعل امر کیساتھ آنحضور کو مخاطب کیا گیا ہے۔

● نٓ کے خطاب سے سورہ قلم میں مَآ اَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمَجْنُوْنٍ ۝ ۲/۶۸ کے الفاظ میں اَنْتَ اور كَ ضمائر مخاطب کے دو مرتبہ کے تکرار کیساتھ آنحضور ہی کو مخاطب کیا ہے ـــــ صٓ، قٓ اور نٓ یک حرفہ مقطعات ہیں۔ ان میں حرفِ مقطعہ قٓ کے خطاب کے بعد فاصبر فعل امر اگرچہ ذرا دور جاکر وارد ہوا ہے لیکن اس سے حرفِ مقطعہ کی اصل حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ یک حرفہ مقطعہ صٓ کے قریب كَ ضمیر مخاطب آئی ہے۔ اور نٓ حرفِ مقطعہ کے بالکل متصل دو مرتبہ کے تکرار کیساتھ آنحضور کیلئے اَنْتَ اور كَ دو ضمائر مخاطب واقع ہوئی ہیں۔

● حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ کے خطاب سے سورہ شوریٰ میں يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۲/۴۲ کے الفاظ میں دو مرتبہ کے تکرار کیساتھ آنحضورؐ ہی کیلئے كَ ضمیر مخاطب لائی گئی ہے۔ اور ان ہر دو ضمائر کا مرجع حٰمٓ عٓسٓقٓ ہی ہے۔

● كٓهٰيٰعٓصٓ کے خطاب سے سورہ مریم میں ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ ۲/۱۹ کے الفاظ میں آنحضورؐ ہی کیلئے كَ ضمیر مخاطب لائی گئی ہے جس کا مرجع كٓهٰيٰعٓصٓ ہی ہے۔

۳۰۔ حروفِ مقطّعات کے الگ الگ مفاہیم

یہاں تک تو صرف اس امر کی وضاحت کیگئی ہے کہ قرآن کریم میں آمدہ حروفِ مقطّعات اپنے اپنے پورے الفاظ سے قطع کردہ پہلے حروف ہیں۔ اور چونکہ ہر ایک کے بعد آنحضور کے نام یا تو کسی فعل امر کیساتھ کوئی حکم دیا گیا ہے۔ اور یا كَ ضمیر مخاطب کیساتھ آپکو خطاب کیا گیا ہے۔ لیس یہ سب آنحضور سلام علیہ کے وہ القابِ گرامی ہیں جن کیساتھ خداوند تعالیٰ نے آپکو مخاطب کرکے اپنا پیغام اپنے بندوں تک پہنچایا ہے۔ اب رہا سوال حروفِ مقطّعات کے مطالب و مفاہیم کا:۔

جواباً عرض ہے کہ جسطرح سی۔ آئی۔ سی کا مفہوم ملٹری ڈیپارٹمنٹ ہی بتا سکتا ہے کہ یہ کمانڈر ان چیف کا مخفف ہے اور ڈی۔ ایس۔ پی کے مفہوم کی وضاحت محکمہ سول ہی کر سکتا ہے کہ یہ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کا قائم مقام ہے اسیطرح قرآنی حروفِ مقطّعات کا مفہوم صرف قرآن کریم ہی سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ مضمون کے شروع میں آپ دیکھ چکے ہیں کہ حرفِ مقطّعہ سٓ کا مفہوم خود قرآن کریم نے متعیّن کیا ہے سیّد۔

اب باقی حروفِ مقطّعات کا مفہوم آئینۂ قرآنیہ میں ملاحظہ فرمائیں ـــــ یاد رہے کہ حروفِ مقطّعات اگرچہ ۲۹ سورتوں کے شروع میں آئے ہیں لیکن بعض مقطّعات چونکہ تکرار وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً الٓمّٓ چھ سورتوں کے شروع میں، الٓرٰ پانچ سورتوں، طٰسٓمّٓ دو سورتوں، اور حٰمٓ چھ سورتوں کی ابتدا میں آئے ہیں۔ اسلئے حروفِ مقطّعات کی تعداد ۱۴ ہے لہٰذا بالترتیب ۱۴ نمبروں میں ان کے قرآنی مفاہیم، خود آیاتِ قرآنیہ کی روشنی میں حاضرِ خدمت ہیں:۔

۳۰/۱ الٓمّٓ۔ یہ چار حروف ہیں۔ الف۔ لام اور میم مشدّدہ، جن کیساتھ چھ سورتوں، بقرہ، آل عمران، عنکبوت، روم،

لقمان اور سجدہ کے شروع میں آنحضور کو مخاطب کیا گیا ہے۔ الف سے امین۔ لام سے لین القلب میم سے مرسل اور میم ثانی سے محمدؐ مراد ہے۔ یہ حروف بالترتیب مذکورہ الفاظ سے قطع کردہ پہلے حروف ہیں اور اپنے اپنے پورے لفظ کے قائم مقام ہیں۔ ثبوت کیلئے سطور ذیل بغور ملاحظہ فرمائیں۔

ا۔ الف سے امین مراد ہے

قرآن کریم شاہد ہے کہ اللہ کے سب نبی رسول امین تھے۔ خداتعالیٰ نے سورہ شعرا میں متعدد رسولوں کو خود انہیں کے الفاظ میں امین بنا کر قرآن کریم میں قیامت تک کے لئے محفوظ کر رکھا ہے:۔

● حضرت نوحؑ نے قوم سے کہا:۔ اِنِّیْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ۲۶/۱۰۶۔ اور بجنسہٖ یہی جملہ حضرت ہودؑ کیطرف سے ۲۶/۱۲۵ میں۔ حضرت صالحؑ کی طرف سے ۲۶/۱۴۳ میں، حضرت لوطؑ کیطرف سے ۲۶/۱۶۲ میں، اور حضرت شعیبؑ کیطرف سے ۲۶/۱۷۸ میں موجود ہے۔ مندرجہ بالا قرآنی شواہد اور لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۲/۲۸۵ کے مطابق اللہ تعالیٰ کے جملہ نبی رسول امین تھے، اور چونکہ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ۳۶/۳ کے خداوندی ارشاد کے مطابق حضور سلام علیہ بھی رسولوں میں سے ایک تھے۔ لہٰذا حضور بھی امین ہیں۔ اور چونکہ الٓمّٓ حضور کے القاب گرامی ہیں۔ لہٰذا الٓمّٓ میں الف اپنے پورے لفظ امین کا قطع کردہ پہلا حرف اور اسی کا قائمقام ہے۔

ب۔ لام سے لین القلب مراد ہے حضور لین القلب تھے۔

اللہ کا پیغام جب اللہ کے رسول، اُسکے بندوں تک پہنچاتے، تو سرکش لوگ رُسل انبیاء پر قسم قسم کی پھبتیاں کستے اور طعنے دیتے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ آنحضور سلام علیہ کو مفتری، ساحر، کاہن اور مجنون وغیرہ کے بُرے القاب سے ملقب کرکے آپکا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ جب مخالفین مجلس رسولؐ میں آتے تو اُنکا اندازِ کلام اسقدر تمسخر و تضحیک کا مرقع ہوتا کہ اگر حضور متین و متحمل مزاج نہ ہوتے تو برہم ہوجاتے، اور لوگ مجلس سے اُٹھ کر چلے جاتے لیکن حضور اسقدر متحمل مزاج اور نرم دل (لین القلب) واقع ہوئے تھے کہ آپکو شاعر، کاہن، دیوانہ اور مفتری کی پھبتیاں برہم نہیں کرسکتی تھیں۔ اسی چیز کی وضاحت میں آنحضور کے متعلق ارشاد ہوتا ہے:۔

● فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۳/۱۵۹ = صاحب قرآن اللہ کی رحمت سے لوگوں کیلئے، آپ لین القلب نرم دل ہیں۔ اگر آپ غلیظ القلب سخت دل ہوتے تو لوگ

؎ اللہ کے رسول امین رسالت تھے۔ اللہ کے پیغام میں کمی نہ کرتے تھے نہ زیادتی۔ سابقہ انبیاء اپنی اپنی قوم کیطرف بھیجے گئے تھے لیکن آنحضور کے بعد چونکہ کوئی نبی رسول آنیوالا نہیں تھا اسلئے آپ سے اعلان کروایا گیا:۔ ● قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۷/۱۵۸ = اے رسول اعلان کر دیجئیگا کہ لوگو! میں تم سب (یعنی قیامت تک کی نوعِ انسانی) کیطرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

آپ کی مجلس سے بھاگ جاتے۔ دیکھئے! یہاں حضورؐ کی صفت **غلیظ القلب** کی ضد **لین القلب** بیان ہوئی ہے پس حروف مقطعات الٓمّٓ میں لام اپنے پورے الفاظ لین القلب کا پہلا قطع کردہ حرف اور انہی کا قائمقام ہے۔

ج میم سے مراد ہے مرسل

الٓمّٓ کا میم اوّل لفظ مرسل کا قطع کردہ پہلا حرف اور اسی کا قائمقام ہے۔ حضور کا مرسل ہونا آیت ذیل سے ثابت ہے:۔ اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۳/۳۶

د میم ثانی سے مراد ہے محمدؐ حمد در حمد کیا ہوا

الٓمّٓ کا میم ثانی لفظ محمدؐ کا پہلا قطع کردہ حرف ہے۔ محمدؐ کے معنے ہیں حمد در حمد کیا ہوا بے حد تعریفوں والا۔ یہ بھی آنحضور کا لقب گرامی ہے۔ جو کثرت استعمال کی بدولت آپ کا نام مشہور ہو چکا ہے۔ قرآن کریم نے حضور کا نام نامی اور اسم گرامی احمدؐ بتایا ہے۔ حضرت عیسیٰ سلام علیہ کے الفاظ میں مذکور فی القرآن ہے:۔

● وَاِذْ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًاۢ بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ ؕ ۶/۶۱ = اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب مریم کے بیٹے عیسیٰؑ نے کہا کہ اے بنی اسرائیل! میں تمہاری طرف اللہ کا بھیجا ہوا آیا ہوں۔ توراۃ کی تصدیق کرنیوالا ہوں، جو مجھ سے پہلے آچکی ہے۔ اور ایک رسولؐ کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئیگا۔ اُس کا نام **احمدؐ** ہوگا۔

دیکھئے! قرآنی شہادت کے مطابق حضور کا اسم گرامی احمدؐ ہے۔ اور محمدؐ چونکہ آپکے القاب کی فہرست میں مذکور ہے۔ اسلئے قرآنی رہنمائی کے مطابق حضورؐ کا لقب گرامی ہے —— یاد رہے کہ اس سے ہماری غرض کوئی نئی بحث کھڑی کرنا نہیں۔ بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قرآن کریم اس امر کی رہنمائی کرتا ہے کہ جب لفظ محمد کا کسی دوسری زبان میں ترجمہ کیا جائے تو اسکے معنے اجاگر کئے جائیں:۔

محمدؐ بمعنی حمد در حمد اور تعریف در تعریف کیا ہوا۔

المختصر! الٓمّٓ کے الف سے مراد ہے امین۔ لام سے لین القلب میم اوّل سے مرسل اور میم ثانی سے مراد ہے محمد (حمد در حمد کیا ہوا)۔ سلامٌ علیٰ الٓمّٓ

۲/۳۰۔ الٓمّٓصٓ یہ پانچ حرف ہیں جو صرف سورہ اعراف کے شروع میں آئے ہیں۔ پہلے چار حروف کی وضاحت سطور بالا میں گزر چکی ہے۔ آخری حرف صٓ، صاحب النّاس اور صاحب قرآن کا پہلا قطع کردہ حرف، اور انہی کا قائمقام ہے۔

● مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ ۲/۵۳ میں کُمْ ضمیر جمع مذکر مخاطب آئی ہے۔ جو زمانۂ رسالت سے لیکر قیامت تک کے مخاطبین سے خطاب کرتی چلی جائیگی۔ فلہذا صَاحِبُكُمْ کی قرآنی خبر کے مطابق حضور صاحبُ النّاس (یعنی دنیائے انسانیت کے ساتھی (مونس و غمخوار) تھے۔ اور پیشتر عرض کیا جا چکا ہے کہ ۷/۱۵۸ کے مطابق آنحضورؐ قیامت تک کی نوع انسانی کے رسولؐ تھے۔

کیونکہ آپکے بعد کوئی نبی رسول آنیوالا نہیں۔ اور قیامت تک کی نوعِ انسانی کیساتھ آپکی مذکورہ مصاحبت صرف اور صرف اس کتاب مقدس کے واسطے ہی سے قائم ہے اور قائم رہیگی جو قیامت تک کے لوگوں کے پاس اپنے صحیح متن کیساتھ پہنچنے والی ہے، یعنی قرآن کریم۔ اسلئے ثابت ہوا کہ حضور سلامٌ علیہ صاحب النّاس بھی ہیں اور صاحب قرآن بھی ـــ فلہٰذا آلمّٓصٓ میں الف سے امین، لام سے لین القلب، میم اوّل سے مرسل میم ثانی سے محمد اور صٓ سے صاحب قرآن اور صاحب النّاس مراد ہے۔ (سلامٌ علیٰ آلمّٓصٓ)

۳۰/۴ ـ الٓرٰ ـ یہ تین حروف ہیں جو سورہ یونس، ہود، یوسف، ابراہیم اور حجر کی ابتدا میں آئے ہیں۔ پہلے دو حروفِ مقطّعات الف اور لام کی وضاحت اُوپر گزر چکی ہے۔ تیسرا حرف ہے رٰا۔ جو رَاکِعٌ سے علامت تخصیت قطع کردہ پہلا حرف ہے۔ قرآن کریم میں آنحضور کے نام حکم صادر ہوا ہے۔ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ ۱۱/۱۱۴ + ۱۷/۷۸ ۔ جس میں آنحضور کو ہمیشہ صلوٰۃ ادا کرتے رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ نیز قرآنی شہادت کے مطابق آپ قرآن کریم کے سوفیصدی متبع تھے اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۶/۵۰ + ۱۰/۱۵ + ۴۶/۹ پس آپ سوفیصدی صلوٰۃ گزار تھے۔ اور چونکہ قیام، رکوع اور سجدہ صلوٰۃ کے رُکن ہیں۔ پس آپ قائم بھی تھے قیامِ صلوٰۃ کرنے والے۔ راکع بھی تھے رکوعِ صلوٰۃ کرنیوالے۔ اور ساجد بھی تھے سجدۂ صلوٰۃ کرنیوالے۔

فلہٰذا الٓرٰ میں الف سے امین، لام سے لین القلب اور رٰا سے راکع مراد ہے۔ (سلامٌ علیٰ الٓرٰ)

۳۰/۴ ـ آلمّٓرٰ ـ یہ پانچ حروف ہیں جو سورہ رعد کے شروع میں آئے ہیں۔ الف۔ لام۔ میم۔ میم۔ رٰا۔ ان پانچوں کی وضاحت اُوپر گزر چکی ہے۔ امین۔ لین القلب، مُرسل، محمد، راکع۔ (سلامٌ علیٰ آلمّٓرٰ)

۳۰/۵ ـ یٰسٓ کی وضاحت اُوپر گزر چکی ہے کہ یا حرفِ ندا اور سٓ منادیٰ ہے۔ جو سیّد کا پہلا قطع کردہ حرف ہے۔ (سلامٌ علیٰ سٓ)

۳۰/۹ ـ صٓ ـ یہ صاحب قرآن کا پہلا قطع کردہ حرف ہے۔ وضاحت کیلئے دیکھئے عنوان آلمّٓصٓ (سلامٌ علیٰ صٓ)

۳۰/۲ ـ قٓ ـ قائم کا پہلا قطع کردہ حرف ہے۔ قیامِ صلوٰۃ کرنیوالا۔ وضاحت کیلئے دیکھئے عنوان الٓرٰ۔ (سلامٌ علیٰ قٓ)

۳۰/۲ ـ نٓ ـ سورہ قلم کے شروع میں آیا ہے۔ اور نذیر کا قطع کردہ پہلا حرف ہے۔ قرآنی سند کیلئے ملاحظہ ہو آیت ذیل، جس میں آپ کو قیامت تک کی نوعِ انسانی کیلئے نذیر ٹھہرایا گیا ہے: قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ ○ ۲۲/۴۹ = اے رسول! اعلان کر دیجئیگا کہ اے نوعِ انسانی میں تم سب کے لئے نذیرٌ مبین ہوں۔ (سلامٌ علیٰ نٓ)

۳۰/۹ ـ طٰہٰ ـ یہ دو حرف ہیں طا اور ہا، جو بالترتیب طاہر اور ہادی کے پہلے قطع کردہ حروف اور انہی الفاظ کے قائمقام ہیں۔ ملاحظہ ہوں قرآنی اسناد:۔ ● اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ ○ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ○ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ○

۵۶/۷۷تا۷۹ = بیشک وہ ایک بلند مرتبہ قرآن ہے۔ کائنات کی پُراسرار کتاب میں موجود ہے۔ اِسکی طرف صرف وہی لوگ آتے ہیں، جو طاہر و پاکیزہ ہیں ـــ اب چونکہ قرآنِ کریم کا نزول ہی آنحضور سلامٌ علیہ پر ہُوا تھا۔ لہٰذا حضورؐ بدرجۂ اولیٰ طاہر و اطہر ہیں ـــ اِسکے بعد حضورؐ کے ہادی ہونے کی قرآنی سند ملاحظہ فرمائیں۔ ارشادِ باری ہے :۔ اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّ لِکُلِّ قَوْمٍ ھَادٍ ۱۳/۷ = اے رسُولؐ! بیشک آپ نذیر ہیں۔ اور ہر ایک قوم کیلئے ایک ہادی ہے۔ آنحضورؐ چونکہ قُلْ یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّمَآ اَنَا لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ کے مطابق قیامت تک کی اقوام کیلئے نذیر ہیں۔ اِس سے ثابت ہُوا کہ سابقہ انبیاء الگ الگ اقوام کیلئے ہادی اور نذیر تھے لیکن آپ قیامت تک کیلئے ہادی اور نذیر ہیں۔ پس حروفِ مقطّعات طٰہٰ میں طٰ سے مراد طاہرؐ اور ہٰ سے مراد ہادیؐ ہے۔ (سلامٌ علیٰ طٰہٰ)

۳۰/۱۰ ـ طٰسٓ ۔ سورہ نمل کے شروع میں آئے ہیں۔ طٰ سے مراد طاہر اور سٓ سے مراد سیّد ہے۔ ہر دو حروف کی وضاحت گزر چکی ہے۔ (سلامٌ علیٰ طٰسٓ)

۳۰/۱۱ ـ طٰسٓمّٓ ۔ سورہ شعرا، اور قصص کے شروع میں آئے ہیں۔ ان چاروں حروف طٰ، س، میم اوّل اور میم ثانی کی وضاحت گزر چکی ہے۔ طٰ سے مراد طاہرؐ، س سے سیّد، میم اوّل سے مُرسل اور میم ثانی سے محمدؐ مراد ہے۔ محمد و رحمد کیا ہُوا۔ (سلامٌ علٰے طٰسٓمّٓ)

۳۰/۱۲ ـ حٰمٓ ۔ یہ دو حروف ذیل کی چھ سورتوں کی ابتداء میں آئے ہیں۔ مومن، حٰم سجدہ، زخرف، دُخان، جاثیہ اور احقاف۔ حٰ سے مراد حاملِ قرآن اور میم سے مراد محمدؐ ہے، محمد و رحمد کیا ہوُا۔ حاملِ قرآن کی قرآنی سند یہ ہے :۔ ● فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۲/۹۷ = اے رسُولؐ! بیشک جبریلؑ نے قرآنِ کریم کو آپکے قلبِ اطہر پر نازل کیا ہے۔ چونکہ حضورؐ نزولِ قرآن کے متحمل ہیں۔ لہٰذا آپ حاملِ قرآن ہیں۔ میم کی وضاحت گزر چکی ہے۔ اِس سے مراد مُرسل بھی ہے اور محمدؐ بھی۔ (سلامٌ علیٰ حٰمٓ)

۳۰/۱۳ ـ حٰمٓ عٓسٓقٓ ۔ یہ پانچ حروف سُورہ شُوریٰ کی ابتداء میں آئے ہیں۔ حٰ سے حاملِ قرآن مراد ہے۔ م سے محمدؐ ـ محمد و رحمد کیا ہُوا۔ عٓ سے عبداللہ۔ سٓ سے سیّد اور قٓ سے قائم (قیامِ صلوٰۃ کرنیوالا)۔ اِن حروف میں سے حٰ، م، س اور ق کی وضاحت گزر چکی ہے۔ عٓ سے عبداللہ کی قرآنی سند ملاحظہ فرمائیں۔ سورہ جن میں ارشاد ہُوا ہے :۔ ● وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبْدُ اللّٰهِ یَدْعُوْهُ ۷۲/۱۹ = اور یہ کہ بیشک، جب عبداللہ (اللہ کا بندہ محمدؐ قیامِ صلوٰۃ میں اللہ کے حضور) کھڑا ہوتا ہے تو اُسکے حضور میں دعائیں کرتا ہے۔ لہٰذا عبداللہ بھی آنحضورؐ کا ایک لقبِ گرامی ہے، جس کا قطع کردہ حرف عٓ، عٓسٓقٓ میں آیا ہے۔ (سلامٌ علیٰ حٰمٓ عٓسٓقٓ)

۳۰/۱۴ ـ کٓھٰیٰعٓصٓ ۔ یہ پانچ حروفِ مقطّعات سُورہ مریم کے شروع میں آئے ہیں۔ جن میں یا سے مراد ہے یامِنؐ یعنی برکت دینے والا۔ اور باقی بالترتیب کریم، ہادی، عبداللہ اور صاحبِ قرآن کے پہلے قطع کردہ حروف ہیں۔ ان میں سے ہٰ، عٓ اور صٓ کی

وضاحت گزر چکی ہے۔ کٓ کی قرآنی سند درج ذیل ہے۔ ارشادِ باری ہے :- ● اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ ۝ ۶۹/۴۰ ‑ بلاشبہ قرآن کریم اہلِ عالم کے سامنے قول کی صورت میں ایک رسُولِ کریم کی زبانِ مبارک سے پیش ہُوا ہے۔ اِس آیت میں آنحضور بارشادِ الٰہی کریم کے گرامی لقب سے ملقب کئے گئے ہیں۔ لہٰذا اِن حروفِ مقطعات میں کٓ کریم کا قطع کردہ حرف اور اِسی کا قائمقام ہے۔ (سلام علیٰ کھیٰعٓصٓ)

گزارش قرآن کریم کے حروفِ مقطعات، جو آنحضور کے وہ القاب گرامی ہیں، جن کیساتھ خداوندِ عالم آنحضور کو مخاطب فرمایا کرتے تھے، انکا قرآنی مفہوم ۱۴ نمبروں میں تمام ہُوا۔ اِن میں بعض حروف ایسے ہیں۔ جو ایک سے زیادہ مفاہیم کے حامل ہیں مثلاً قرآن کریم کی روشنی میں نٓ سے نذیر بھی ثابت ہے اور نبی بھی۔ عٓ سے عبداللہ بھی ثابت ہے اور عابد بھی۔ صٓ سے صادق بھی ثابت ہے اور صاحبِ قرآن اور صاحبُ النّاس بھی۔ حٓ سے حامد بھی ثابت ہے اور حاملِ قرآن بھی۔ اسطرح حروفِ مقطعات کی وضاحت میں جن الفاظ کو قرآنی اسناد کی تائید حاصل ہو اُن کے تسلیم کرنے میں کسی راستباز کو انکار نہیں ہوسکتا لیکن یہ نظریہ ہرگز ہرگز قابلِ قبول نہیں ہوسکتا کہ حروفِ مقطعات کا مفہوم کوئی نہیں جانتا۔ حتیٰ کہ خود رسُولِ مقبول بھی نہیں جانتے تھے۔ جن کے یہ اپنے القاب گرامی ہیں۔ اور یا صرف اللہ اور رسول جانتے ہیں، انہوں نے کسی کو نہیں بتایا۔

۳۱ ‑ حرُوف کی بحث

قرآن فہمی کیلئے جہاں یہ لازم ہے کہ ہر لفظ کے صحیح مقامی معنے لئے جائیں۔ وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ عربی ادب کی رُو سے، جن ذُومعنی حرُوف کے کئی کئی معنے مسلّم ہیں۔ اُن میں سے وُہ معنے لئے جائیں، جو نہ سیاق وسباق کے خلاف جاتے ہوں، اور نہ قرآنی کلیہ جات وعالمی مشاہدات کی مخالفت لازم آتی ہو۔ ذیل میں چند حروف مثلاً واؤ، اَوْ، با، فا، فِیْ، مِنْ، عَنْ، اِلٰی، کلّا، بَلْ اور دُوْن وغیرہ کے متعدد معنے قرآنِ کریم کی روشنی میں پیش کئے جاتے ہیں۔ ان میں سے بعض معنے سابقہ مفسرین ومترجمین نے لئے ہی نہیں۔ حالانکہ قرآنی لغت نے اُن معنوں کو وضاحتاً اجاگر کر رکھا ہے۔

۳۱/۱ واؤ کے استعمالات

واؤ عاطفہ الفاظ کا عطف الفاظ پر اور جملے کا عطف جملے پر ہوتا ہے

۱۔ **واؤ بمعنی اَور**۔ ایسی واؤ عاطفہ کہلاتی ہے۔ الفاظ کا عطف الفاظ پر اور جملوں کا عطف جملوں پر ہوتا ہے۔ مثلاً آیت مجیدہ :-

● خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۱۶/۳ میں لفظ ارض کا عطف لفظ سماوات پر ہے۔ اور آیت مجیدہ :-

● فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ ۱۳/۴۰ میں جملہ عَلَيْنَا الْحِسَابُ کا عطف جملہ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ

پر ہے۔

خبر کا عطف خبر پر، امر کا عطف امر پر اور مثال کا عطف مثال پر ہوتا ہے

● لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ ۷/۵۹ = بیشک ہم نے نوح کو اسکی قوم کی طرف بھیجا۔ ● وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ۷/۶۵ = اور بیشک ہم نے قوم عاد کیطرف اُن کے بھائی ہُودؑ کو بھیجا۔ ● وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۷/۷۳ = اور بیشک ہم نے قوم ثمود کیطرف اُن کے بھائی صالحؑ کو بھیجا۔ وَاِلٰى مَدْيَنَ اَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۷/۸۵ = اور بیشک ہم نے اہل مدین کیطرف اُن کے بھائی شعیبؑ کو بھیجا۔ دیکھئے اِن آیات کریمات میں، چھ، چودہ اور چھبیس آیتوں کے وقفہ کے بعد بھی خبر کا عطف خبر ہی پر آیا ہے۔ اور اوّلین معطوف علیہ ۷/۵۹ میں مذکور لَقَدْ اَرْسَلْنَا کی خبر کے الفاظ، اگرچہ ۷/۶۵، ۷/۷۳ اور ۷/۸۵ میں دُہرائے نہیں گئے۔ بلکہ صرف اِلٰى عَادٍ، اِلٰى ثَمُوْدَ اور اِلٰى مَدْيَنَ آیا ہے۔ لیکن بوجہ معطوف اَرْسَلْنَا کی خبر، اِن تینوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے ـــ اب امر کا عطف، امر پر کی مثال ملاحظہ فرمائیں۔ سورہ بنی اسرائیل میں ابلیس کو مخاطب کرکے ارشاد ہُوا ہے:-

● قَالَ اذْهَبْ فَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ فَاِنَّ جَهَنَّمَ جَزَآؤُكُمْ جَزَآءً مَّوْفُوْرًا ○ وَ[1] اسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ وَ[2] اَجْلِبْ عَلَيْهِمْ بِخَيْلِكَ وَ[3] رَجِلِكَ وَ[4] شَارِكْهُمْ فِى الْاَمْوَالِ وَ[5] الْاَوْلَادِ وَ[6] عِدْهُمْ ؕ وَ[7] مَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطٰنُ اِلَّا غُرُوْرًا ○ ۱۷/۶۳-۶۴ ـــ دیکھئے اِن دو آیتوں میں یکے بعد دیگرے سات واؤ آئی ہیں ـــ پہلی، دوسری، چوتھی اور چھٹی واؤ یکے بعد دیگرے اِذْهَبْ امر پر عطف ہیں۔ تیسری اور پانچویں میں الفاظ کا عطف الفاظ پر ہے۔ اور ساتویں اظہارِ حقیقت کیلئے آئی ہے۔ آیات کریمات کے مفہوم پر غور فرمائیں:-

اللہ نے کہا جا، جو کوئی تیری اتباع کریگا۔ تو تابع اور متبوع، تم سب کا پورا پورا بدلہ جہنم ہوگا۔ اور تو اپنی آواز کے ساتھ جسے بہکا سکتا ہے بہکالے۔ اور اُن پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے۔ اور اُنکے مالوں اور اولاد میں شریک ہوجا۔ اور انہیں جھوٹے وعدے دیتا رہ۔ حقیقت یہ ہے کہ شیطان اُنہیں جو بھی وعدہ دیتا ہے وہ فریب محض ہے ـــ (مثال کا عطف مثال پر، اسکی متعلقہ آیات مجیدہ، اَوْ عاطفہ کے تحت آگے آرہی ہیں)

۲- واؤ بمعنی لیکن۔ ۳- واؤ بمعنی کیونکہ۔ ۴- واؤ برائے اظہارِ حقیقت، کیلئے آیت ذیل پر غور فرمائیں۔ اِس میں تین واؤ آئی ہیں۔ پہلی کا معنی ہے لیکن، دُوسری کا معنی ہے کیونکہ۔ اور تیسری اظہارِ حقیقت کے لئے آئی ہے:-

● يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ النَّاسِ وَ[1]لَا يَسْتَخْفُوْنَ مِنَ اللّٰهِ وَ[2]هُوَ مَعَهُمْ اِذْ يُبَيِّتُوْنَ مَالَا يَرْضٰى مِنَ الْقَوْلِ ؕ وَ[3] كَانَ اللّٰهُ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطًا ○ ۴/۱۰۸ = وہ (چھپ چھپ کر تجویزیں کرنیوالے منافق) لوگوں سے

چھپ سکتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سے نہیں چھپ سکتے۔ کیونکہ جب وہ رات کو چھپ کر ایسی تجویزیں کرتے ہیں جنہیں وہ پسند نہیں کرتا۔ اُسوقت بھی وہ اُنکے ساتھ ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ جو بھی عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ انہیں گھیرے ہوئے ہے۔

۵- **واؤ بمعنی بلکہ**۔ آئتِ ذیل میں تین واؤ آئی ہیں۔ پہلی کا معنیٰ ہے بلکہ۔ دُوسری میں جملے کا عطف جملے پر ہے اور تیسری اظہارِ حقیقت کیلئے آئی ہے:- فَلَا تَخْشَوُا النَّاسَ وَاخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ وَ مَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ ۵/۴۴ = پس لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ مجھ سے ڈرو۔ اور میری آئتوں کے بدلے دُنیا کا حقیر مال حاصل نہ کرنا۔ حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰہُ کے ساتھ حکم نہیں کرتے۔ وہی تو کافر ہیں۔

۶- **واؤ بمعنی جبکہ**:- ● اَنّٰی یَکُوْنُ لَہٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَکُنْ لَّہٗ صَاحِبَۃٌ ؕ ۶/۱۰۱ = اللہ کا بیٹا کسطرح ہو سکتا ہے جبکہ اُسکی بیوی ہی کوئی نہیں۔ یہاں واؤ حالیہ تسلیم کرنا بھی درست ہے۔ حالانکہ اُسکی بیوی ہی کوئی نہیں۔

۷- **واؤ تفسیر بمعنی یعنی**:- تِلْکَ اٰیٰتُ الْکِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِیْنٍ ۝ ۱۵/۱ = مذکورہ بالا آئتیں الکتاب یعنی بیان کرنیوالے قرآن کی ہیں۔

۸- **واؤ بمعنی اسلئے** — جب حضرتِ موسیٰ سلام علیہ نے قوم بنی اسرائیل کو ارضِ مقدس کے ایک شہر میں داخل ہونے کا حکم دیا۔ تو انہوں نے جواب دیا:-

● قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِنَّ فِیْھَا قَوْمًا جَبَّارِیْنَ ۖ وَاِنَّا لَنْ نَّدْخُلَھَا حَتّٰی یَخْرُجُوْا مِنْھَا ج ۵/۲۲ = بنی اسرائیل نے کہا کہ اے موسیٰ، اِس شہر میں ایک طاقتور قوم ہے۔ اِسلئے ہم اُسوقت تک اِس شہر میں داخل نہیں ہونگے جبتک کہ وہ اُس میں سے نکل نہ جائیں۔

۹- **واؤ بمعنی حالانکہ**۔ آئتِ ذیل میں اہلِ کتاب کو مخاطب کرکے کہا گیا ہے:-

● اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ ط ۲/۴۴ = کیا تم لوگوں کو بھلائی کا حکم کرتے ہو۔ اور اسکے ضمن میں اپنے آپکو بھلا دیتے ہو۔ حالانکہ تم توراۃ و انجیل کی تلاوت کرتے ہو (جن میں ایسا کرنے سے منع کر دیا گیا ہے)

۱۰- **واؤ بمعنی تو، پھر، پس (یعنی واؤ بمعنی فا)**:- ● وَجَعَلَ لَکُمْ مِّنَ الْفُلْکِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْکَبُوْنَ ۝ لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُھُوْرِہٖ ثُمَّ تَذْکُرُوْا نِعْمَۃَ رَبِّکُمْ اِذَا اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْہِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا ھٰذَا ...... ۴۳/۱۲-۱۳ = اور اللہ نے تمہارے لئے جہاز اور چارپائے بنائے جن پر سوار ہوتے ہو۔ تاکہ (اُن میں سے ہر ایک کی پیٹھ پر سیدھے (متوازن) سوار ہوا کرو پھر تم اپنے رب کی نعمت کو یاد کرو، جب تم اُس پر باطمینان سوار ہو جاؤ۔ تو کہا کرو پاک ہے وہ ذات جس نے انہیں ہمارے لئے مسخر کر دیا ہے ...... الخ — یہاں واؤ بمعنی تو آیا ہے۔ اگلی آئتوں میں دیکھئے۔ واؤ بمعنی یعنی دربارۂ اظہار صفت ہے

● وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
اور اللہ کی نعمت کو یاد رکھو، جو تم پر کی گئی، یعنی جو اُس نے تم پر اپنی حکمت والی کتاب نازل کی ہے۔ وُہ تمہیں اُس ایک ہی کتاب کیساتھ نصیحت کرتا ہے۔ پس اللہ کے قانون کی مخالفت سے بچتے رہو۔ ۲/۲۳۱

۱۱۔ **واؤ برائے اظہارِ صفت**۔ آیتِ بالا میں الکتٰب والحکمۃ کی واؤ سے یہ مراد نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب اور حکمت الگ الگ دو چیزیں نازل فرمائی ہیں۔ کیونکہ یَعِظُکُمْ بِہٖ میں ہ ضمیر واحد آئی ہے جس سے ثابت ہے کہ یہ ایک چیز ہے وہ نہیں اور الکتٰب والحکمۃ کی درمیانی واؤ کا معنٰی یٰسٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ کے الفاظ میں بتا دیا گیا ہے = شہادت ہے حکمت والے قرآن کی۔ پس اِس قرآنی شہادت اور یعظکم بہ کی ضمیر واحد کی رُو سے الکتٰب الحکمۃ کا معنٰی ہے حکمت والی کتاب۔

۱۲۔ **واؤ بمعنی بذریعہ**۔ وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۹/۳ = اور حج اکبر کے دن لوگوں کیلئے اللہ کا اعلان ہے اُسکے رسُول کے **ذریعہ** کہ بیشک اللہ تعالیٰ مشرکوں سے بیزار ہے۔ دیکھئے یہاں واؤ بمعنی بذریعہ آیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حج اکبر کو اپنا مذکورہ بالا اعلان، کہ وُہ مشرکوں سے بیزار ہے اپنے رسُول ہی کے ذریعہ کروایا تھا۔ نیز مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۳۳/۱۲ میں بھی واؤ بمعنی کے ذریعہ آئی ہے۔ کیونکہ اللہ اپنے رسُول کے ذریعہ ہی وعدہ فرماتا ہے۔ خود آکر نہ کوئی وعدہ دیتا ہے نہ لیتا ہے۔

۱۳۔ **واؤ بمعنی اَوْ (یا)** آیتِ ذیل میں واؤ بمعنی یا ہے۔ قوم بنی اسرائیل کے متعلق ارشاد ہُوا ہے:۔
● ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ ۳/۱۱۲ = بنی اسرائیل پر وہ جہاں کہیں بھی پائے جائیں، ذِلّت لازم کر دی گئی ہے۔ سوائے اِسکے کہ وُہ اللہ کے قانون کو تھام لیں **یا** لوگوں کے بنائے ہُوئے قوانین میں سے کسی قانون کا سہارا لے لیں۔

۱۴۔ **واؤ استیناف**۔ اِس واؤ کیساتھ سابقہ مضمون سے الگ نیا مضمون شروع ہوتا ہے یعنی اِسکا نہ ماقبل کے کسی لفظ پر عطف ہوتا ہے، نہ کسی جُملے پر۔ صرف ماقبل عنوان کے کسی گوشے کے متعلق کچھ واضح کرنا مطلوب ہوتا ہے:۔ ● وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ حُكْمًا عَرَبِيًّا ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَهُمْ بَعْدَ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا وَاقٍ ۝ ۱۳/۳۷ = اور اسیطرح ہم نے آپ پر اپنا حکنامہ شُستہ عربی زبان میں نازل کیا ہے۔ اور اگر آپنے ہمارا علم آجانے کے بعد لوگوں کی خواہشات کی پیروی کی تو آپکا اللہ کے سوا نہ کوئی مددگار ہوگا اور نہ کوئی اُسکے عذاب سے بچانیوالا ہوگا۔ دیکھیے یہاں وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ ..... الخ کی واؤ کا عطف، نہ ماقبل کسی لفظ پر ہے نہ جُملے پر۔ صرف مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ کے متعلق اِس امر کی وضاحت کیگئی ہے کہ اگر اسے چھوڑ کر رسُول مقبول بھی کسی کی اتّباع کرینگے تو اُنہیں بھی چھڑانیوالا کوئی نہیں ہوگا۔

۱۵۔ **واؤ برائے معیت بمعنی نیز**:۔ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْــــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ

۵/۱۷ = بیشک وہ لوگ کفر کرتے ہیں، جو کہتے ہیں کہ مسیح ابنِ مریم ہی اللہ ہے۔ اَے رسُوؐل! کہدیجئیگا۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ یہ ارادہ کرتا کہ مسیح ابنِ مریم اور اُسکی ماں، نیز (اُنکے ساتھ) زمین میں جو بھی جاندار ہیں، سب کو ہلاک کر دیتا۔ تو کون ہوتا جو اُسکی منشاء کے خلاف کچھ بھی اختیار رکھتا ——— دیکھئے، وَمَنْ فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا والی واؤ معیّت کی ہے۔ چونکہ نصاریٰ مسیح کو عین اللہ اور حضرت مریم و مسیح دونوں کو شریکِ اُلوہیت ٹھہراتے ہیں۔ لیکن مریم کو مُردہ اور مسیح کو زندہ مانتے ہیں۔ اِسلئے یہاں بتایا گیا ہے کہ صرف مریم ہی نہیں بلکہ دونوں ماں بیٹا فوت ہو چکے ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کی مشیّت میں ہوتا تو وہ اُنکے ساتھ زمین کے ہر جاندار کو ہلاک کر دیتا۔ اُسے کون روکنے والا تھا۔ لیکن یہ اُسکی مشیت میں نہیں۔

۱۶۔ **واؤ برائے قسم** (شہادت)، کسی مقدّمہ میں جب گواہوں سے گواہی لیجاتی ہے تو وہ اللہ کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یہ واقعہ یُوں ہُوا تھا۔ فی الحقیقت گواہ یہ کہتا ہے کہ میں اپنے بیان پر اللہ حاضر و شاہد کی شہادت پیش کرتا ہوں۔ عربی ادب میں اِسکے لئے وَاللّٰہِ کی اصطلاح استعمال کیجاتی ہے۔ لیکن یاد رہے کہ جب اللہ تعالیٰ خود کوئی شہادت پیش کرتا ہے تو اپنے پیدا کردہ اُن شاہکاروں کو، جن میں ابتدائے آفرینش سے آجتک کوئی تغیر نہیں آیا، گواہی کیلئے پیش کرتا ہے۔ ورنہ قسمیں کھانا اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہے۔ مثلاً:۔

وَالشَّمْسِ۔ وَالْقَمَرِ۔ وَالَّیْلِ۔ وَالنَّھَارِ وغیرہ کا معنیٰ ہے، شہادت ہے سورج کی، شہادت ہے چاند کی۔ شہادت ہے رات کی۔ شہادت ہے دن کی، کہ جسطرح یہ حقائق ثابتہ ہیں۔ اُسی طرح یہاں جو کچھ بیان کیا جا رہا ہے وہ بھی ایک لاریب حقیقت ہے۔

المختصر! قرانی لغت کے مطابق واؤ کے متعدد معنے قرانِ کریم میں موجود ہیں:۔ اور، لیکن، کیونکہ، حقیقت یہ ہے بلکہ، جبکہ، یعنی، اِسلئے، حالانکہ، تو، پھر، برائے اظہارِ صفت، بذریعہ، یا، استیناف، معیت اور شہادت۔

اب یہ فیصلہ قارئین کرام پر رہا کہ ان میں سے دُوسرے، تیسرے، چوتھے، پانچویں اور چھٹے نمبر والے پانچ معنے (جن کی قرانِ کریم نے باندازِ صریح وضاحت کر رکھی ہے۔ کیا سالقہ تراجم میں کہیں یہ معنے آپ کو ملتے ہیں؟

٣١/٢ اَوْ کے مختلف استعمالات

مثال کا عطف مثال ہی پر ہوتا ہے

۱۔ اَوْ بمعنی یا۔ وضو کیلئے پانی موجود نہ ہو یا مُضر پڑتا ہو تو تیمم کے حکم میں، یکے بعد دیگرے تین مرتبہ اَوْ آیا ہے۔ اور تینوں کا معنیٰ ہے یا:۔

وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰٓى اَوْ عَلٰى سَفَرٍ اَوْ جَآءَ اَحَدٌ مِّنْكُمْ مِّنَ الْغَآئِطِ اَوْ لٰمَسْتُمُ النِّسَآءَ فَلَمْ تَجِدُوْا مَآءً فَتَيَمَّمُوْا صَعِيْدًا طَيِّبًا...... ۵/۶ = اور اگر تم بیمار ہو اور پانی کا استعمال مُضر پڑتا ہو، یا تم مسافر ہو، یا تم میں سے کوئی قضاءِ حاجت سے آیا ہو، یا تم نے بیویوں کو ازدواجی انداز سے چھُوا ہو اور پانی نہ پاؤ تو آلائش صاف کرنے کیلئے پاکیزہ مٹی کا استعمال کر لیا کرو۔

واؤ عاطفہ کی بحث میں قرانی مثالوں کیساتھ ثابت کیا جا چکا ہے کہ الفاظ کا عطف الفاظ پر، جملوں کا جملوں پر،

خبر کا خبر پر، اور امر کا امر ہی پر پڑتا ہے۔ اب اَوْ عاطفہ کی بحث میں ملاحظہ فرمائیں کہ مثال کا عطف مثال ہی پر ہوتا ہے۔

سورہ بقرہ یعنی ابتدائے قرآن مجید میں آنحضرت پر واضح کیا گیا ہے کہ سلسلۂ تبلیغ میں آپکو تین قسم کے افراد سے واسطہ پڑیگا۔ پہلے مومن، جو آپ پر اور قرآن پر ایمان لے آئینگے۔ وہ آپ پر جان مال سب کچھ قربان کر دینگے۔ دوسرے کافر یعنی مطلقاً انکار کرنیوالے۔ اُن کے ساتھ مغز مارنے کی ضرورت نہیں۔ اور تیسرے منافق، جو کفر چھپا کر ایمان کا اظہار کرینگے ـــــ اِسی سورہ بقرہ میں اِن تینوں گروہوں کی دو دو مثالیں لف نشر غیر مرتّب کے انداز میں اِس طرح بیان ہُوئی ہیں کہ ٢/١٧ و ١٩ میں دو مثالیں منافقوں کی۔ ٢/١٧١ و ٢٥٩ میں دو مثالیں کافروں کی۔ اور ٢/٢٦١ و ٢٦٥ میں دو مثالیں مومنوں کی بیان ہُوئی ہیں ـــ منافقوں کی دو مثالیں یہ ہیں :-

● مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّآ اَضَآءَتْ مَا حَوْلَهٗ ...... الخ ٢/١٧ = اُن (منافقوں) کا حال اُس شخص جیسا ہے جو (رات کو) آگ جلائے۔ جب وہ جل اُٹھے تو اُسکا اِرد گرد روشن ہو جائے اور جب بجھ جائے تو وہ پھر اندھیروں میں رہ جائے۔

دیکھئے، یہاں کَمَثَلِ میں کاف حرفِ تشبیہ موجود ہے۔ جو کسی دفعہ کیلئے نہیں آتا۔ بلکہ مثال کیلئے آتا ہے، چنانچہ اِس مثال پر، مثال کا عطف پھر کاف تشبیہ کیساتھ اِس سے اگلی آیت ٢/١٩ میں آیا ہے :-

● اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ج ٢/١٩ = یا اُنکا حال اُس شخص کے حال جیسا ہے کہ (رات کیوقت) آسمان سے بارش ہو رہی ہو، اُس میں رات، بارش اور بادلوں کے اندھیرے بھی ہوں، گرج بھی ہو اور بجلی کی چمک بھی ہو۔ جب بجلی چمکے تو اُنکا اِرد گرد روشن ہو جائے۔ اور جب بند ہو جائے تو وہ پھر اندھیروں میں پڑے رہیں۔ یعنی منافقوں کا حال یہ ہے کہ قرآنِ کریم سنا تو خیالات روشن ہو گئے۔ لیکن جب لوٹ کر کافروں میں گئے۔ تو پھر کفر کا اندھیرا چھا گیا۔ (اِن آیات کی تفصیل اپنے مقام پر آگے آ رہی ہے)

اس سے آگے کافروں کی دو مثالوں میں سے پہلی مثال ٢/١٧١ میں مذکور ہے :- ● وَمَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِىْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ ..... الخ، اور دُوسری ٢/٢٥٩ ● اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ ...... الخ میں آئی ہے

واضح رہے کہ جسطرح ٢/١٧ اور ٢/١٩ باہم معطوف معطوف علیہ ہیں۔ کیونکہ دونوں میں کاف تشبیہ موجود ہے، اور مثال کا عطف مثال پر ہے۔ اُسیطرح ٢/١٧١ اور ٢/٢٥٩ بھی باہم معطوف معطوف علیہ ہیں۔ دونوں میں کاف تشبیہ موجود ہے۔ اور مثال کا عطف مثال پر ہے ـــ سابقہ تراجم اور تفاسیر نے مثال پر مثال کے عطف کے قرآنی اصول کو نظر انداز کر کے آیتِ مجیدہ اَوْ كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ ٢/٢٥٩ کیساتھ حضرتِ عُزیرؑ کیطرف منسوب کر کے ایک عجیب و غریب چیستانی واقعہ چسپاں کر رکھا ہے کہ آپ ایک اُجڑی ہوئی بستی سے گزرے تو کہا کہ اِسے اللہ کسطرح زندہ کریگا۔ اللہ نے آپکو سَو سال کیلئے مار ڈالا پھر زندہ کیا وغیرہ۔ حالانکہ مَرَّ فعل ماضی پر اَلَّذِىْ اسم موصول داخل ہُوا ہے۔ جس نے مَرَّ ماضی کو مضارع بنا دیا

ہے۔ اور مفہوم الفاظ یہ ہے کہ یا اُس شخص کی مانند کہ جو کسی برباد بستی پر سے گزرے۔ اور کہے کہ اللہ اسے کسطرح دوبارہ زندہ کریگا۔ اِس پر خدا تعالیٰ اُسے مار ڈالے۔ وہ سو برس مرا پڑا رہے۔ اتنے میں بستی آباد ہو جائے۔ اللہ اُسے زندہ کرے۔ اُسکا کھانا اور پانی خراب نہ ہوا ہو۔ مگر اُسکے گدھے کی ہڈیاں بکھر گئی ہوں۔ اللہ اُسکے دیکھتے دیکھتے، اُن ہڈیوں پر گوشت چڑھا کر گدھے کو زندہ کر دے۔ پھر وہ کہے میں نے جان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ یاد رہے کہ اِسطرح کسی کو قیامت منوانا، خدا تعالیٰ کے قانونِ مشیّت ہی سے خارج ہے۔ سابقہ تراجم نے اِس مثال کو واقعہ بنا کر حضرتِ عزیر سلام علیہ کے ذمہ لگا رکھا ہے۔ حالانکہ انبیاء سلام علیہم تو، لوگوں کو قیامت منوانے آتے تھے۔ اُنکا اپنا ایمان اِس قسم کا نہیں ہو سکتا۔ کہ جبتک اللہ تعالیٰ مُردہ گدھے کو اُنکے دیکھتے دیکھتے زندہ کر کے نہ دکھائے، اُسوقت تک وہ نہ خدا تعالیٰ کو قادر ہی مانیں اور نہ قیامت پر ایمان لائیں۔ العیاذ باللہ!

المختصر! آیت مجیدہ ۲/۲۵۹، حرفِ عطف اَوْ سے شروع ہوتی ہے۔ اور اُس میں کَالَّذِیْ کا کافِ تشبیہ موجود ہے اب اَوْ عاطفہ اپنے معطوف علیہ کو چاہتا ہے۔ اور اِسکا معطوف علیہ وہی ہو سکتا ہے، جس میں کافِ تشبیہ موجود ہو۔ اور وہ ہے ۲/۱۷۱ میں۔ وہاں صاف صاف لفظاً مذکور ہے کہ کافروں کی مثال ایسی ہے:۔ مَثَلُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا، اور یہاں آیت ماقبل ۲/۲۵۸ میں ایسے کافر بادشاہ کا ذکر ہے۔ جسے حضرت ابراہیم سلام علیہ نے صفاتِ خداوندی کی بحث میں لاجواب کر دیا۔ لیکن وہ ایمان نہ لایا — لہٰذا ۲/۲۵۹ میں بتایا گیا ہے کہ ایک تو ذریعۂ ہدایت یہ ہے کہ حقیقتِ حال کو حضرتِ ابراہیم کی طرح اِس طرح علیٰ وجہ البصیرت سمجھا دیا جائے کہ مخاطب لاجواب ہو جائے۔ اِس سے آگے مثال کے طور پر بیان ہوا ہے کہ جو کافر دلائل قاطعہ کیساتھ نہ مانے، تو یا پھر ایسا ہو کہ اُسے اللہ تعالیٰ اُجڑی ہوئی بستی آباد کر کے دکھائے، مُردہ ہڈیوں پر گوشت چڑھانے کا مشاہدہ کرائے تو پھر وہ مانے۔ لیکن ایسا نہ کبھی ہوا ہے نہ ہوگا۔ کافروں کے متعلق سورہ مجیدہ کی ابتداء ہی میں کہدیا گیا ہے:۔

● إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ○ ۲/۶ = اے رسول! کافروں کو آپکا سمجھانا اور نہ سمجھانا برابر ہے۔ وہ ایمان نہیں لائینگے۔

اِس سے آگے مومنوں کی دو مثالوں میں سے پہلی مثال بقرہ ۲/۲۶۱ میں آئی ہے:۔ ● مَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ ...... الخ = مومنوں کا حال جو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں ایک دانے کے حال جیسا ہے کہ ہر دانے سے سات بالیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور ہر بال میں سو سو دانہ پیدا ہوتا ہے — غور فرمائیگا! کہ اِس آیت میں كَمَثَلِ حَبَّةٍ میں کافِ تشبیہ وارد ہوا ہے۔ اِسکے بعد ۲/۲۶۵ میں واوٗ عاطفہ اور کاف تشبیہ ہی کیساتھ مومنوں کی دوسری مثال اِن لفظوں میں بیان ہوئی ہے:۔

● وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَتَثْبِيتًا مِّنْ أَنفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ ...... الخ = اور مومن جو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے، اور اپنے معاشرہ کے کمزوروں کو قدموں پر کھڑا

کرنے کیلئے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے ہیں، اُنکا حال ایسا ہے جیسے کہ ایک زرخیز ٹیلے پر ایک باغ ہو۔ اگر اُسے بارش میسر آجائے تو کئی گنا پھل دے۔ اور اگر بارش نہ بھی ہو اُسکے لئے شبنم بھی کافی رہے ـــــ اب غور فرمائیگا کہ ہر دو آیات کریمات میں مثال کا عطف مثال ہی پر ہے۔

۲۔ اَوْ بمعنی بلکہ۔ ۳۷/۱۴۷ میں حضرت یونس سلامٌ علیہ کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ ○ = اور ہم نے اُسے ایک لاکھ افراد بلکہ اِس سے بھی زیادہ لوگوں کیطرف رسول بناکر بھیجا تھا ـــــ دیکھئے! اگر اِس آئت میں اَوْ بمعنی یا لیا جائے تو علم الٰہی پر زد پڑتی ہے کہ ہم نے اُسے ایک لاکھ یا اس سے بھی زیادہ افراد کی طرف بھیجا تھا۔ فلہذا ثابت ہؤا کہ اَوْ بمعنی بلکہ بھی عربی ادب میں مسلّم ہے۔

۳۔ اَوْ بمعنی حتّیٰ کہ، یہانتک کہ۔ ۴۸/۱۶ میں آیا ہے:۔ ● قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِىْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ ○ = اے رسُولؐ! دیہاتیوں میں سے پیچھے رہ جانیوالوں سے (جو غنیمت کے طلبگار ہیں) کہدیجئیگا کہ تم عنقریب ایک سخت جنگجو قوم کیساتھ لڑنے کیلئے بلائے جاؤگے۔ تم اُن سے (ایسی سخت) جنگ کروگے۔ یہانتک کہ وُہ تمہاری اطاعت قبول کرلینگے ـــــ غور فرمائیگا کہ یہاں بھی اَوْ بمعنی یا نہیں لگ سکتا۔ کیونکہ یہ مفہوم بالکل بے معنی ہے کہ "یا تم اُن سے لڑوگے یا وہ تمہاری اطاعت قبول کرلینگے"۔

۴۔ اَوْ برائے انقسام مفہوم۔ ۷/۴ میں آیا ہے کہ مجرموں پر:۔ ● فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ○ = ہمارا عذاب اُن پر کبھی رات کے وقت آیا۔ اور کبھی دوپہر کیوقت، کہ جب وہ آرام کررہے تھے۔

۵۔ اَوْ برائے نفی تام۔ ۷۶/۲۴ میں آنحضور سلامٌ علیہ کو مخاطب کرکے ارشاد ہؤا ہے:۔
● فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ○ = اے رسُولؐ! اپنے ربوبیّت کرنیوالے کے حکم پر ثابت قدم رہیگا۔ اور (مخالفین) بدکار و ناشکرے (جو کچھ بھی) ہیں۔ تم اُنکی اطاعت ہرگز نہ کرنا۔

۶۔ اَوْ برائے شکّ و اشتباہ۔ سورہ مومنون میں آیا ہے کہ قیامت کے دن پُوچھا جائیگا کہ تم زمین میں کتنا عرصہ رہے۔ اِسکا جواب درج ہے:۔ ● قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۲۳/۱۱۳ = وُہ کہینگے کہ ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصّہ زمین میں رہے تھے۔

۷۔ اَوْ بمعنی واؤ تفسیر۔ ۳/۱۶۷ میں آیا ہے کہ منافقوں سے کہا گیا:۔ ● وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ط = اور اُنہیں کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یعنی ملک کا دفاع کرو ـــــ غور فرمائیگا! کہ جنگ اور دفاع ایک ہی چیز ہے۔ اور یہاں اَوْ بمعنی واؤ تفسیر بمعنی یعنی آیا ہے۔ جیسے کہ آئت مجیدہ کے اگلے الفاظ، منافقوں کے جواب میں بھی قتال ہی کو دفاع ٹھہرایا گیا ہے:۔
● قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنٰكُمْ = اُنہوں نے کہا کہ (ہم لڑنا نہیں جانتے) اگر لڑنا جانتے تو ضرور تمہاری

پیروی کرتے۔

۳۱/۲ ب کے مختلف استعمالات ب۔ کا معنی عموماً ساتھ لیا جاتا ہے لیکن قرآن کریم نے ذیل کے سولہ معنے بیان کئے ہیں:۔

۱۔ با برائے تعدیہ (لازم کو متعدی بنانے کیلئے):۔
● ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ ۲/۱۷ اللہ انکا نور لیگیا۔ (لفظی ترجمہ)
۲۔ با اظہار سبب کیلئے:۔ ● فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۳/۱۱ = پس اللہ نے انہیں انکے گناہوں کے سبب سے پکڑ لیا۔
۳۔ با بمعنی کیساتھ:۔ ● يٰنُوْحُ اهْبِطْ بِسَلٰمٍ ۱۱/۴۸ = اے نوحؑ سلامتی کیساتھ اُتر جا۔
۴۔ با بمعنی کے پاس:۔ ● اِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ ۲۵/۷۲ = جب وہ لغو کے پاس سے گزرتے ہیں۔
۵۔ با بمعنی کے عوض:۔ ● وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍ بَخْسٍ ۱۲/۲۰ = اور انہوں نے اُسے تھوڑی قیمت کے عوض بیچ دیا۔
۶۔ با بمعنی کے متعلق:۔ ● اَلرَّحْمٰنُ فَسْئَلْ بِهٖ خَبِيْرًا ۲۵/۵۹ = اسکے متعلق، صاحب خبر رحمان سے پوچھ۔
۷۔ با بمعنی میں سے:۔ ● عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ ۷۶/۶ = ایک چشمہ ہے جس سے اللہ کے بندے پئیں گے۔
۸۔ با بمعنی کیوقت:۔ ● نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ ۵۴/۳۴ = ہم نے انہیں صبح کیوقت نجات دی۔
۹۔ با بمعنی کے مقام پر:۔ ● وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ ۳/۱۲۳ = اور بیشک اللہ نے بدر کے مقام پر تمہاری مدد فرمائی۔
۱۰۔ با بمعنی پر، اوپر:۔ ● لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۴/۴۲ = کاش کہ انکے اوپر زمین ہموار ہو جائے۔
۱۱۔ با بمعنی کا:۔ ● وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ ۵/۶ = اپنے سروں کا مسح کر لیا کرو۔
۱۲۔ با بمعنی کو:۔ ● بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ ۸۲/۹ = بلکہ تم دین کو جھٹلاتے ہو۔
۱۳۔ با بمعنی کے بارے میں:۔ ● مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ ۸۲/۶ = تجھے تیرے نعمتیں دینے والے پروردگار کے بارے میں کس نے دھوکا دیدیا ہے۔
۱۴۔ با بمعنی کے ذریعہ:۔ ● وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ ۱۶/۱۶ = اور وہ ایک مخصوص (قطبی) ستارہ کے ذریعہ راستے معلوم کرتے ہیں۔
۱۵۔ با زائدہ:۔ ● لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ ۸۸/۲۲ = اے رسولؐ! آپ لوگوں پر داروغے نہیں ہیں۔
۱۶۔ با برائے قسم:۔ ● فَبِعِزَّتِكَ ۳۸/۸۲ = تیری عزت کی قسم۔

۳۱/۴ ف کے مختلف استعمالات ف کا معنی عموماً لیا جاتا ہے۔ پھر۔ لیکن قرآنی لغت سے ذیل کے متعدد معنے ثابت ہوتے ہیں۔

۱۔ فا بمعنی پھر۔ (برائے ترتیب و تعقیب)۔ یعنی ایک کام کے بعد دوسرے کا بالترتیب انجام پذیر ہونا:۔
● ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ

لَحْمًا ۲۳/۱۴ = پھر ہم نطفہ کو لوتھڑا بناتے ہیں۔ پھر لوتھڑے کو گوشت کا ٹکڑا، پھر گوشت کے ٹکڑے میں ہڈیاں پیدا کرتے ہیں۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتے ہیں —— دیکھئے! یہاں فا کے ساتھ ہر کام کا یکے بعد دیگرے بالترتیب واقع ہونا بتایا گیا ہے۔ لیکن یاد رہے کہ فا کیلئے لازم نہیں کہ ترتیب و تعقیب ہی کیلئے ہو۔ نیز ترتیب و تعقیب کی صورت میں ہر کام کے بعد دوسرے کام کا درمیانی وقفہ ہر مقام پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے کائناتی قوانین میں خود مقرر کر رکھا ہے۔ قوانینِ کائنات کی مخالفت کبھی نہیں ہوگی۔

۲۔ **فا برائے توضیح بمعنی سو**۔ ● وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ○ ۷/۴ = اور کتنی ہی بستیاں تھیں جنہیں ہم نے ہلاک کر دیا۔ سو ہمارا عذاب اُن پر رات کیوقت آیا، یا جب وہ دوپہر کو آرام کر رہے تھے۔ دیکھئے! یہاں فا کے ساتھ بستیوں کی ہلاکت کے وقت کی وضاحت کیگئی ہے کہ ہمارا عذاب کسی پر رات کو آیا۔ اور کسی پر دوپہر کو آیا۔

۳۔ **فا بمعنی تو** (اگر اِنِ شرطیہ کے بعد آئے)۔ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ ۳/۳۱ = کہہ دیجئیگا! اگر تم اللہ سے محبّت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔

۴۔ **فا بمعنی ورنہ**۔ ● هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِیْۤ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ○ ۷/۷۳ = (حضرت صالحؑ نے قوم سے کہا) یہ اللہ کی اونٹنی، تمہارے لئے (ربوبیّتِ عامہ کی رُو سے اللہ کی) ایک نشانی ہے۔ پس اسے چھوڑ دو کہ یہ اللہ کی زمین میں سے کھائے۔ اور اِسے ضرر نہ پہنچانا **ورنہ** تمہیں دردناک عذاب پکڑ لیگا۔

۵۔ **فا بمعنی اِس طرح**۔ ● فَوَكَزَهٗ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۲۸/۱۵ = پس اُس (حضرت موسٰیؑ) نے اُسے مُکّا مارا۔ اِس طرح اُسکا کام تمام کردیا۔

۶۔ **فا بمعنی لیکن**۔ ● وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِیْۤ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا ۷/۱۷۵ = اور اے رسولؐ! آپ اِن پر اُس شخص کی خبر پڑھیئے۔ جسے ہم نے (اپنی کتاب کے ذریعہ) اپنی آیتیں عطا فرمائیں **لیکن** وہ اُن کی حدود سے نکل گیا۔

۷۔ **فا برائے اظہارِ حقیقت**۔ غیراللہ کو مددگار ٹھہرانیوالوں کے متعلق ارشاد ہوا ہے:۔ ● اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ○ ۴/۱۳۹ = کیا وہ غیراللہ سے غلبہ طلب کرتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ غلبہ سارے کا سارا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کیلئے ہے۔

۸۔ **فا زائدہ**۔ ● بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ ۳۹/۶۶ = بلکہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کر۔ یہاں فا زائدہ ہے کیونکہ فا کے بغیر بھی یہی معنے بنتے ہیں۔

۳۱/۵ - س

۱۔ س برائے مستقبل قریب۔ س حرف تہجّی ہے جس کا عمومی فائدہ یہ ہے، کہ جب یہ مضارع پر داخل ہو تو اُسے زمانہ مستقبل کیلئے مختص کر دیتا ہے۔ مثلاً:۔

● قُلْ مَنْ يَرْزُقُكُمْ ...... فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۱۰/۳۱ = اے رسول! آپ ان سے پوچھیگا کہ تمہیں رزق کون دیتا ہے؟ ...... اسکے جواب میں وہ کہینگے اللہ تعالیٰ ـــــ دیکھیگا! اس مثال میں يَقُوْلُوْنَ فعل مضارع پر سَ داخل ہوا ہے۔ جس سے فعل مضارع نے مستقبل کا فائدہ دیا ہے لیکن یاد رہے کہ یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے کہ سَ داخل ہونے سے فعل مضارع ضروری ہی مستقبل کیلئے مختص ہو جاتا ہو۔ کیونکہ قرآنِ کریم میں ایسی متعدّد مثالیں موجود ہیں کہ سَ داخل ہونے سے مستقبل کا معنیٰ لینا غلط ہے۔ مثلاً:۔

۲۔ س برائے تاکید۔ ● فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۲/۱۳۷ کا یہ مفہوم ہرگز صحیح نہیں ہے کہ "تیرے لئے تیرے مخالفوں کے مقابلے پر اللہ تعالیٰ زمانہ حال میں کافی نہیں مستقبل میں کافی ہوگا" بلکہ صحیح مفہوم یہ ہے کہ "تیرے لئے تیرے مخالفوں کے مقابلے پر اللہ تعالیٰ ضرور ضرور کافی ہے" ـــــ دیکھئے! یہاں زمانہ حال کا معنیٰ لینا ہی درست ہے۔ نیز یاد رہے کہ حال میں استقبال از خود آجاتا ہے۔ کیونکہ آج کا مستقبل کل کو حال بنکر آتا ہے۔ اور فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ کے مطابق کفائتِ خداوندی کے دوام کی دلیل بن کر آتا ہے۔ اِسکے برعکس استقبال میں حال داخل نہیں ہو سکتا۔ اِسلئے اگر آیتِ بالا ۲/۱۳۷ کا یہ معنیٰ لیا جائے کہ اللہ کافی ہے نہیں، کافی ہوگا تو کفائتِ خداوندی مجروح ہو جاتی ہے۔ پس ثابت ہوا کہ یہاں مستقبل کا معنیٰ لینا غلط ہے۔ فلھذا ثابت ہوا کہ یہ قاعدہ کُلیہ نہیں ہے کہ مضارع پر سَ داخل ہو تو ضروری اُسے مستقبل کیلئے مختص کر دیتا ہے۔ بلکہ ثابت ہوا کہ مضارع پر سَ داخل ہو تو بعض اوقات حال کے معنوں میں تاکید پیدا کر دیتا ہے۔ اسی عنوان کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیں:۔

● سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ ۸۷/۶ ۔ دیکھئے یہاں نُقْرِئُ فعل مضارع پر سَ داخل ہوا ہے۔ اگر اِسے مستقبل کیلئے مختص کر دیا جائے۔ تو یہ مفہوم سامنے آتا ہے "ہم آپکو پڑھائینگے پھر آپ بھولینگے نہیں"۔ یہ مفہوم مشاہدے کے خلاف ہے۔ کیونکہ جس وقت آپکو سَنُقْرِئُكَ کہا گیا تھا اسوقت تعلیم قرآنی دی جا رہی تھی۔ ہنوز دی جانیوالی نہیں تھی۔ پس اس آیت کا صحیح مفہوم یہ ہے۔ کہ "یقیناً یقیناً ہم آپ کو پڑھاتے ہیں پھر آپ ہرگز بھولتے نہیں"۔

پس سَ کے مضارع پر داخلہ کے خواص قرآنِ کریم کی رُو سے یہ ہیں:۔ ● کبھی فعل مضارع کو مستقبل کا فائدہ دیتا ہے۔ اور کبھی حال کے معنوں میں تاکید پیدا کرتا ہے یعنی یقیناً ایسا ہے یا ایسا ہوتا ہے۔

۳۱/۶ - فی کے مختلف استعمالات

فی حرفِ جار کا عموماً معنیٰ لیا جاتا ہے "میں"۔ لیکن قرآنی لغت سے ذیل کے متعدّد معنے ثابت ہیں:۔

۱۔ فی بمعنی میں:۔ ● وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۴/۱۳۱ = اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے۔

۲- فی برائے اظہارِ سبب :- • قَالَتْ فَذٰلِكُنَّ الَّذِىْ لُمْتُنَّنِىْ فِيْهِ ۱۲/۳۲ = اُس عورت (زنِ عزیز) نے زنانِ مصر سے مخاطب ہو کر حضرت یوسف کیطرف اشارہ کرکے) کہا، یہ ہے وُہ جس کی وجہ سے تم مجھے ملامت کرتی تھیں

۳- فی بمعنی کے مقابلے پر :- • فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِى الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ ۹/۳۸ = آخرت کی کامیابی کے مقابلے پر دنیا کا مال ہیچ ہے۔

۴- فی بمعنی کے لئے :- • فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِىْۤ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۲/۲۳۴ = پھر جب بیوہ عورتوں کی عدّت پُوری ہوجائے تو تمہارے لئے اُس کام میں کوئی حرج نہیں جو وُہ اپنی جانوں کیلئے بطریق معروف کریں (یعنی نکاح ثانی کریں)

۵- فی بمعنی کے ذریعہ :- • اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِى الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ۵/۹۱ = بلاشبہ شیطان (ضابطۂ خداوندی کا منکر) ارادہ کرتا ہے کہ تمہارے درمیان خمر و میسر کے ذریعہ عداوت اور بغض پیدا کردے۔

۳۱/۷- مِن کے مختلف استعمالات | عموماً مِن بمعنی سے لیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم سے ذیل کے متعدد معنے ثابت ہیں:-

۱- مِنْ ابتدائیہ بمعنی سے :- • مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ۱۷/۱ مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک۔

۲- مِنْ بیانیہ برائے استغراق :- • فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ ۲۲/۳۰ = سب کے سب بتوں کی نجاست سے بچتے رہو۔

۳- مِنْ بعضیہ :- • وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۴۰/۷۹ = اور چارپایوں میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔

۴- مِنْ بمعنی کیطرف سے :- • اِنِّىْۤ اُلْقِىَ اِلَىَّ كِتٰبٌ كَرِيْمٌ ۝ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ ۲۷/۲۹-۳۰ = بیشک میری طرف ایک معزز چھٹی بھیجی گئی ہے۔ بلاشبہ وُہ سلیمان کیطرف سے ہے۔

۵- مِنْ بمعنی کی وجہ سے :- • مِمَّا خَطِيْٓئٰتِهِمْ اُغْرِقُوْا ۷۱/۲۵ = وہ اپنی خطاؤں کیوجہ سے غرق کئے گئے۔

۶- مِنْ بمعنی کی بجائے :- • اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ ۹/۳۸ = کیا تم آخرت (کی کامیابی) کی بجائے، دُنیا (کے مال) پر راضی ہوگئے ہو؟

۷- مِنْ بمعنی میں سے :- • وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ۝ ۱۵/۲۶ = اور بیشک ہم نے انسان کو سڑی ہوئی مٹی کے بدبودار گارے میں سے پیدا کیا۔

۸- مِنْ بمعنی کے ساتھ :- • يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِىٍّ ۴۲/۴۵ = وہ کنکھیوں کیساتھ دیکھتے ہیں۔

۹۔ مِنْ بمعنی کے مقابلے پر :۔ ● وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۲۱/۷۷ = اور ہم نے اُسکی اُس قوم کے مقابلے پر مدد کی جس نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا۔

۱۰۔ مِنْ بمعنی کے ہاں :۔ ● لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْئًا ۵۸/۱۷ = اللہ کے ہاں اُن کے مال اور اولاد کسی کام نہیں آئینگے۔

۱۱۔ مِنْ بمعنی کے :۔ ● اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ ۶۲/۹ = جب تم کو صلوٰۃ کیلئے ندا دی جائے جمعہ کے دن۔

۱۲۔ مِنْ برائے تمیز :۔ ● وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۲/۲۲۰ = اور اللہ اُس مفسد کو جانتا ہے جو مُصلح کے لبادے میں فساد کرتا ہے۔

۱۳۔ مِنْ بمعنی کے بدلے :۔ ● اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ اَنَّ لَهُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لِيَفْتَدُوْا بِهٖ مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيٰمَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۵/۳۶ = بیشک اگر منکرین ضابطہ خداوندی کے پاس زمین بھر کی پوری دولت ہو اور اتنی ہی اور بھی ہو۔ اسلئے کہ وہ قیامت کے عذاب کے بدلے فدیہ دیں تو اُن سے ہرگز قبول نہیں کی جائیگی۔

۱۴۔ مِنْ بمعنی کوئی بھی :۔ ● مَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا ۶/۵۹ = نہیں گرتا کوئی بھی پتہ، مگر اللہ اُسے جانتا ہے

● وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۳/۶۲ = اور نہیں ہے کوئی بھی الٰہ سوائے اللہ کے۔

۱۵۔ مِنْ زائدہ اور مِمَّا بمعنی اسلئے کہ :۔ ● وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۵/۸۳ = اور جب وہ (قرآن) سنتے ہیں جو رسول کیطرف نازل ہوا ہے۔ تو تو دیکھتا ہے اُنکی آنکھوں کو کہ آنسو بہاتی ہیں۔ اسلئے کہ وہ حق کو پہچانتے ہیں۔

۳۱/۸ عَنْ

عن حرفِ جار کا معنی عموماً سے لیا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم میں ذیل کے متعدد معنوں میں استعمال ہوا ہے :۔

۱۔ عَنْ بمعنی سے :۔ ● مَا كَانَ لِاَهْلِ الْمَدِيْنَةِ وَمَنْ حَوْلَهُمْ مِّنَ الْاَعْرَابِ اَنْ يَّتَخَلَّفُوْا عَنْ رَّسُوْلِ اللّٰهِ ۹/۱۲۰ = مدینہ والوں اور آس پاس کے دیہات والوں کو یہ لائق نہیں تھا کہ وہ اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جائیں۔

۲۔ عَنْ بمعنی پر :۔ ● رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۹/۱۰۰ = اللہ اُن پر راضی ہوگیا اور وہ اللہ پر راضی ہوگئے۔

۳۔ عَنْ بمعنی کا، کے، کی :۔ ● وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ ۴۲/۲۵ = اور وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔

۴۔ عَنْ برائے الٹے معنے:۔ ● اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِھَتِیْ یٰۤاِبْرٰھِیْمُ ۱۹/۴۶ = اے ابراہیمؑ! کیا تو میرے معبودوں کی ساتھ رغبت رکھنے والا نہیں ہے۔

۵۔ عَنْ بمعنی کے بعد:۔ ● لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۸۴/۱۹ = تم ایک طبقہ کے بعد دوسرے طبقہ پر ضرور چڑھوگے۔

۶۔ عَنْ بمعنی میں آکر:۔ ● وَمَا نَحْنُ بِتَارِكِیْۤ اٰلِھَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ ۱۱/۵۴ = اور ہم تیری باتوں میں آکر اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں۔

۷۔ عَنْ بمعنی کے مطابق:۔ ● وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ اِبْرٰھِیْمَ لِاَبِیْهِ اِلَّا عَنْ مَّوْعِدَةٍ وَّعَدَھَاۤ اِیَّاهُ ۹/۱۱۴ = ابراہیم کا اپنے باپ کیلئے استغفار کرنا ایک وعدہ کے مطابق تھا، جو اُسکے ساتھ اُنہوں نے کیا۔

۸۔ عَنْ بمعنی کے ساتھ:۔ ● وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۵۳/۳ = اور وُہ اپنی خواہش کے ساتھ نہیں بولتا۔

۳۱/۹ ۔ عَلٰی کے مختلف استعمالات

حرفِ جار عَلٰی کا معنی عام طور پر لیا جاتا ہے پر۔ لیکن قرآن کریم میں ذیل کے متعدد معنوں میں استعمال ہُوا ہے:۔

۱۔ عَلٰی بمعنی پر:۔ ● وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ ۲۳/۲۲ = اور تم کشتیوں پر سوار کئے جاتے ہو۔

۲۔ عَلٰی بمعنی سے:۔ ● اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ ۸۳/۲ = جب وہ لوگوں سے ناپ کر لیتے ہیں۔

۳۔ عَلٰی بمعنی میں:۔ ● وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ ۲/۱۸۵ = اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو۔

۴۔ عَلٰی بمعنی کے مطابق:۔ ● لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا ھَدٰىكُمْ ۲/۱۸۵ = تاکہ تم اللہ کی ہدایت کیمطابق اُسکی بڑائی کا اظہار کرو۔

۵۔ عَلٰی بمعنی کے باوجود:۔ ● وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰی حُبِّهٖ ۲/۱۷۷ = اور مال کی محبت کے باوجود حاجتمندوں کو مال دیتا ہے۔

۶۔ عَلٰی بمعنی کے متعلق:۔ ● اَنْ لَّاۤ اَقُوْلَ عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۷/۱۰۵ = یہ کہ میں اللہ کے متعلق حق کے سوا کچھ نہ کہوں۔

۷۔ عَلٰی بمعنی تک:۔ ● ھٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسْتَقِیْمٌ ۱۵/۴۱ = یہ سیدھا راستہ مجھ تک پہنچتا ہے۔

۸۔ عَلٰی بمعنی کے سامنے:۔ ● وَلِتُصْنَعَ عَلٰی عَیْنِیْ ۲۰/۳۹ = اور تاکہ تیری پرورش میری نگاہ کے سامنے کی جائے۔

۹۔ عَلٰی بمعنی کے ذریعہ:۔ ● مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰی رُسُلِكَ ۳/۱۹۴ = تُو نے ہمارے ساتھ جو اپنے رسولوں کے ذریعہ وعدہ کیا تھا۔

۱۰۔ عَلٰی بمعنی فرض ہے:۔ ● فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ ۳/۲۰ = پس اے رسولؐ! سوائے اِسکے اور کوئی بات نہیں کہ آپ پر ہمارا پیغام پہنچانا فرض ہے۔

۱۱۔ عَلٰی بمعنی کے پاس:۔ ● اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ ھُدًی ۲۰/۱۰ = یا میں آگ کے پاس کوئی رہبر پاؤں۔

۱۲۔ عَلٰی بمعنی کے مقابلے پر:۔ ● فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ ۶۱/۱۴ = پس ہم نے اُنکے دشمنوں کے مقابلے پر مومنوں کی مدد فرمائی۔

۳۱/۱۰ - اِلٰی کے مختلف استعمالات | اِلٰی حرفِ جار قرآن کریم میں ذیل کے متعدد مختلف معنوں میں آیا ہے :-

۱- اِلٰی بمعنی تک (زمان کیلئے) :- ● ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۲/۱۸۷ = پھر تم رات تک روزہ مکمل کرو۔
" " " (مکان کیلئے) :- ● مِنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَى الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا ۱۷/۱ = مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ تک۔

۲- اِلٰی بمعنی سمیت :- ● فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ ۵/۶ = اپنے چہرے اور کہنیوں سمیت ہاتھ دھو لیا کرو۔

۳- اِلٰی بمعنی کے ساتھ :- ● وَلَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ اِلٰى اَمْوَالِكُمْ ۴/۲ = اور اپنے مالوں کیساتھ اُن یتیموں کے مال نہ کھا جانا۔

۴- اِلٰی بمعنی کو :- ● لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۴/۸۷ = وہ قیامت کے دن کو تمہیں ضرور اکٹھا کریگا

۵- " " میں :- ● " " " " = " " " " " میں " " " "

۶- اِلٰی زائدہ :- ● اِسی ۴/۸۷ کا مفہوم اِلٰی کے بغیر بھی صحیح برآمد ہوتا ہے کہ = وہ قیامت کے دن تمہیں ضرور اکٹھا کریگا۔

۷- اِلٰی بمعنی کے نزدیک :- ● رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَيَّ ۱۲/۳۳ = اے میرے پروردگار میرے نزدیک قید خانہ اُس سے پسندیدہ ہے۔

۸- اِلٰی بمعنی کے متعلق :- ● وَقَضَيْنَا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۱۷/۴ = اور ہم نے بنی اسرائیل کے متعلق فیصلہ کر دیا۔

۹- اِلٰی بمعنی کے لیئے :- ● وَالْاَمْرُ اِلَيْكِ ۲۷/۳۳ = اور حکم تیرے لئے ہے۔

۱۰- اِلٰی بمعنی کی طرف :- ● وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ○ ۲۲/۵۴ = اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ مومنوں کی صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔

۳۱/۱۱ - كَلَّا حرفِ ردع ہے۔ اِسکا عمومی معنیٰ ہے ہرگز نہیں لیکن قرآن کریم میں اسکے متعدد استعمال موجود ہیں :-

۱- كَلَّا بمعنی بات یوں نہیں ہے :- ● اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ○ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ ۸۳/۱۳-۱۴ = جب اُس پر ہماری آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو وہ کہتا ہے یہ قرآن پہلے لوگوں کی کہانیاں ہیں بات یوں نہیں، یہ قرآن کہانیاں نہیں، بلکہ یہ لوگ جو کسب کرتے رہے تھے اُس نے اِن کے دلوں کو زنگ آلود کر دیا ہے۔

۲- كَلَّا بمعنی ہرگز نہیں :- ● قَالَ اَصْحٰبُ مُوْسٰٓى اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ ○ قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ ○ ۲۶/۶۱-۶۲ = (جب فرعون بنی اسرائیل کا تعاقب کرتا ہوا قریب پہنچ گیا تو) اصحاب موسیٰ نے کہا بیشک ہم پکڑے جانیوالے ہیں۔ موسیٰ نے فرمایا ہرگز نہیں۔ میرا پروردگار ضرور میری رہنمائی کریگا۔ (فرعون کی گرفت سے ضرور بچا لیگا)۔

۳۔ **کَلَّا بمعنی وہ ایسا نہیں کرسکینگے:۔** ● وَلَهُمْ عَلَيَّ ذَنْبٌ فَأَخَافُ أَنْ يَقْتُلُونِ ○ قَالَ كَلَّا ۚ ١٦/١٤-١٥ =
(حضرت موسیٰ نے کہا کہ) فرعونیوں کا میرے ذمّہ ایک جرم ہے (کہ مجھ سے اُنکا ایک آدمی قتل ہوگیا تھا)، اسلئے میں ڈرتا ہوں کہ وہ مجھے قتل نہ کردیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ وہ ایسا نہیں کرسکینگے

۴۔ **کَلَّا بمعنی حقیقت یہ ہے:۔** ● كَلَّا إِنَّ الْإِنسَانَ لَيَطْغَىٰ ٩٦/٦ = حقیقت یہ ہے کہ بلاشبہ انسان، اپنے پروردگار کی نافرمانی کرتا ہے۔

۵۔ **کَلَّا بمعنی ضرور ضرور:۔** ● كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۝ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُونَ ○ ١٠٢/٣-٤ =
ضرور ضرور تم عنقریب جان لوگے۔ پھر سن لوکہ، ضرور ضرور تم عنقریب جان لوگے۔

۳۱/۱۲ بَلْ حرفِ استدراک ہے۔ کبھی کلام ماسبق کی تردید و انکار کیلئے، کبھی تائید و تصدیق کیلئے، اور کبھی وضاحت و اضافہ کیلئے آتا ہے۔ نیز کبھی کلام ماسبق کی تردید کے بغیر، کلام مابعد کی تائید کیلئے آتا ہے۔

۱۔ **بَل برائے تردید و انکار:۔** ● وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمَٰنُ وَلَدًا ۗ سُبْحَانَهُ ۚ بَلْ عِبَادٌ مُّكْرَمُونَ ○
٢١/٢٦ = اور وہ (انبیاء میں سے بعض کے متعلق) کہتے ہیں کہ رحمان نے انہیں بیٹا بنایا ہے۔ وہ بیٹے سے پاک ہے۔ (اس نے کسی نبی کو بیٹا نہیں بنایا، بلکہ وہ اُسکے واجب التکریم بندے تھے۔

۲۔ **بَل برائے تائید و توثیق:۔** ● قَالُوا أَأَنتَ فَعَلْتَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا يَا إِبْرَاهِيمُ ۝ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ ۚ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَاسْأَلُوهُمْ إِن كَانُوا يَنطِقُونَ ○ ٢١/٦٢-٦٣ سابقہ تفسیروں نے اس آیت میں آمدہ بَل کو، برائے تردید و انکار قرار دیکر حضرت ابراہیمؑ کو دروغ گو بنا دیا ہے۔ حالانکہ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ١٩/٤١ کی قرآنی خبر کے مطابق آنحضورؑ ہرگز ہرگز جھوٹ بولنے والے نہیں تھے، نہ دروغ مصلحت آمیز نہ دروغ شرانگیز۔ اسلئے ٢١/٦٣ میں آمدہ بَل تردید و انکار کا نہیں ہوسکتا کہ جب بُت پرستوں نے کہا کہ اے ابراہیم کیا ہمارے بتوں کو تُو نے توڑا ہے۔ تو آنحضورؑ نے جھوٹ بولا ہو کہ میں نے نہیں، بلکہ بڑے بُت نے اِنہیں توڑ ڈالا ہے۔ فلہٰذا یہ بَل تائید و تصدیق کا ہے۔ تردید و انکار کا نہیں۔ اور آیت مجیدہ کا عین قرآنی مفہوم یہ ہے:۔

● بُت پرستوں نے کہا کہ اے ابراہیمؑ! کیا ہمارے معبودوں کیساتھ تُو نے ایسا کیا ہے۔ آپنے فرمایا، اُسی نے کیا ہے (جس کا تم ذکر کررہے تھے) یہ بڑا بُت (صحیح سالم موجود) ہے۔ اگر یہ بول سکتے ہیں تو اِن سے پوچھ لو۔ کہ تمہیں کس نے توڑا ہے۔

عـــہ قَالَ بَلْ فَعَلَهُ کے فعل فَعَلَ کی ھُوَ ضمیر مستتر، أَنتَ اقبل ٢١/٦٢ کے لفظ ابراہیمؑ کی طرف پھرتی ہے۔ کہ جب اُنہوں نے بُتوں کو ٹوٹا ہوا پایا تو ایک دوسرے سے پُوچھا:۔ ● قَالُوا مَن فَعَلَ هَٰذَا بِآلِهَتِنَا = اُنہوں نے کہا ہمارے معبودوں کیساتھ ایسا کس نے کیا ہے۔ دوسروں نے جواب دیا:۔ ● قَالُوا سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ

اِبْرٰهِيْمُ ○ ۲۱/۶۰ = انہوں نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان کے متعلق سنا ہے کہ وہ ان کے ساتھ ایسی تجویز کرنے کا ذکر کرتا تھا۔ اس نوجوان کو ابراہیم کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے جبکہ خود اعلان کر رکھا تھا وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ ۲۱/۵۷ = اللہ کی قسم میں ضرور تمہارے بتوں کیساتھ ایک تجویز کرونگا۔ اسلئے ابراہیم صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۱۹/۴۱ کیطرف دروغ مصلحت آمیز بھی منسوب نہیں ہوسکتا پس ۲۱/۶۳ میں آمدہ بل برائے تردید انکار نہیں بجائے تائید و اقرار ہے۔ (كَبِيْرُهُمْ هٰذَا مرکب ناقص مبتدا اور سالم خبر محذوف ہے۔ قرینہ موجود ہو تو خبر محذوف ہوسکتی ہے پس تقدیر کلام یہ ہے :- كَبِيْرُهُمْ هٰذَا سالم۔ یہ انکا بڑا صحیح سالم ہے اگر یہ بولتے ہیں تو انہی سے پوچھ لو کہ انکے ساتھ توڑ پھوڑ کس نے کی ہے)

۳- بَل برائے وضاحت و اضافہ :- ● بَلْ قَالُوْٓا اَضْغَاثُ اَحْلَامٍۢ بَلِ افْتَرٰىهُ بَلْ هُوَ شَاعِرٌ ۲۱/۵ = بلکہ (ہماری آیتوں کے متعلق) لوگوں نے کہا کہ یہ پریشان خیالات ہیں۔ بلکہ یہ کہا کہ اس نے اپنی طرف سے بنالی ہیں بلکہ یہ کہا کہ یہ رسول تو ایک شاعر ہے۔

۴- بَل برائے تائید کلام بعد ملا تردید کلام سابق ● وَلَدَيْنَا كِتٰبٌ يَّنْطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ○ بَلْ قُلُوْبُهُمْ فِيْ غَمْرَةٍ مِّنْ هٰذَا ۲۳/۶۲-۶۳ = اور ہمارے پاس ایسی کتاب ہے جو سچ بولتی ہے، اور وہ ظلم نہیں کئے جائینگے لیکن ان کے اذہان اسکی طرف سے غفلت میں ہیں۔

۳۱/۱۳ **مِن دُون کے مختلف استعمالات** مِن دُون کا معنیٰ عموماً لیا جاتا ہے "کے سوا" لیکن قرآنی لغت میں اسکا معنیٰ "کے ساتھ" بھی ہے :-

● وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَاَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۵/۱۱۶ اور وہ وقت قابل ذکر ہے جب اللہ تعالیٰ کہیگا کہ اے مریم کے بیٹے عیسیٰؑ! کیا تو نے لوگوں کو کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ کیساتھ دو الٰہ اور ٹھہرالو۔ دیکھیئےگا! یہاں مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا معنیٰ اللہ کے سوا نہیں بلکہ اللہ کیساتھ ہے کیونکہ ۵/۷۳ میں نصاریٰ کا عقیدہ اللہ کیساتھ دو اور الٰہ ٹھہرانا بتایا گیا ہے۔ اللہ کے سوا دو الٰہ ٹھہرانا نہیں بتایا :- ● لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ = بیشک وہ لوگ کافر ہوئے جو کہتے ہیں اللہ تین الاہوں کا تیسرا ہے پس مِنْ دُوْن کا معنیٰ "کے ساتھ" بھی قرآن کریم سے ثابت ہے۔

۳۱/۱۴- **اِلَّا کے مختلف استعمالات** یہ حرف استثنٰی ہے۔ جو عموماً سوائے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن قرآن کریم میں اسکے متعدد معنے موجود ہیں :-

۱- اِلَّا بمعنی سوائے :- ● لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۴۷/۱۹ = اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔

۲- اِلَّا بمعنی ہاں البتہ :- ● فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ ۱۰/۹۸ = پس کیوں نہ ہوئی کوئی ایسی بستی کہ ایمان لاتی تو اسکا ایمان اسے نفع دیتا۔ ہاں البتہ قوم یونس ایسی تھی کہ ایمان لائی اور اسے اسکے ایمان نے فائدہ دیا۔ (یعنی اس سے عذاب خداوندی ٹل گیا)

۳- اِلَّا عاطفہ بمعنی اور:- اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًا بَعْدَ سُوْٓءٍ ۲۷/۱۱ = بیشک میرے رسول ہرگز میرے ہاں نہیں ڈرتے۔ اور وہ شخص بھی نہیں ڈرتا جس نے کوئی زیادتی کی پھر اعمالِ صالحہ کیساتھ برائی کو نیکی کیساتھ بدل دیا۔

۴- اِلَّا برائے استغراق:- اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ ۳۸/۱۴ = بلاشبہ سب نے ہمارے رسولوں کو جھٹلایا۔

۵- اِلَّا بمعنی اِنْ لَا (اگر نہیں):- اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۹/۴۰ = اگر تم اسکی مدد نہ کرو تو کوئی بات نہیں۔ اللہ نے اُسکی مدد اُسوقت بھی کی تھی، جب اُسے کافروں نے نکال دیا تھا۔ (اور آئندہ بھی کرتا رہیگا)

۶- اِلَّا برائے تاکید و تائید:- خَالِدِيْنَ فِيْهَا مَا دَامَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اِلَّا مَا شَآءَ رَبُّكَ ۱۱/۱۰۷ = اہلِ جہنم اُس میں اُسوقت تک رہینگے جبتک کہ آسمان اور زمین موجود ہیں۔ یقیناً تیرے پروردگار نے جو چاہا ہے وہی ہوگا۔ یعنی اُس نے ایسا ہی چاہا ہے کہ جبتک آسمان و زمین موجود ہیں، وہ جہنم میں رہیں ـــــ دیکھئے! یہاں اِلَّا کلام ماسبق کی تاکید و تائید کیلئے آیا ہے۔ تردید کیلئے نہیں آیا۔ اسی طرح ۸۷/۶ میں بھی آیا ہے:- سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۸۷/۶ = اے رسول! بلاشبہ ہم آپ کو پڑھاتے ہیں پھر آپ ہرگز بھولتے نہیں ـــــ اس آیت مجیدہ کے اس ٹکڑے سے ثابت ہوتا ہے کہ نزولِ وحی کیساتھ ہی آنحضور کو قرآن مجید حفظ ہوتا چلا جاتا تھا۔ ایسا حفظ جو آپ کے ذہن مبارک سے کبھی محو نہیں ہوتا تھا۔ اب اس سے آگے آیا ہے اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ـــــ اگر یہاں اِلَّا کو استثنائیہ قرار دیا جائے تو معنی یہ ہوگا کہ "ہم آپ کو پڑھاتے ہیں پھر وہ آپ کو حفظ ہو جاتا ہے آپ ہرگز نہیں بھولتے۔ سوائے اُس کے جسے اللہ بھلانا چاہے"۔ ظاہر ہے کہ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کا یہ مفہوم سیاقِ کلام کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن کریم کے جس حصے کو بھلا دینا ہو اُسکا نازل کرنا، کارِ عبث اور محض ڈرامائی کردار ثابت ہوتا ہے۔ اب چونکہ ایسے کردار سے ذاتِ خداوندی پاک و منزہ ہے۔ پس ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کو آنحضور کے ذہن میں محفوظ کرنے کی جو کیفیت آیت مجیدہ کے پہلے جملے میں بتائی گئی ہے سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰۤى = یقیناً ہم آپکو قرآن کی تعلیم دیتے ہیں پس وہ آپکے ذہنِ مبارک میں محفوظ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس پر جملہ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کی تائید و تاکید کیلئے ہی ہو سکتا ہے، تردید کیلئے نہیں۔ پس سیاقِ کلام کے مطابق اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ کا مفہوم یہ ہے "یقیناً جو چاہا اللہ نے، یعنی اللہ تعالیٰ نے چاہا ہی یہ ہے کہ آپ کو قرآن کی جو تعلیم دی جائے وہ آپ کو ایسی حفظ ہوتی چلی جائے کہ آپ ہرگز ہرگز نہ بھولیں"۔

۷- مَنْ بمعنی یقیناً کیلئے عنوان نمبر ۳۱ میں حرف مَنْ کی بحث ملاحظہ فرمائیں۔

۱۵/۳۲ اِنَّ کے مختلف استعمالات ...... حرفِ تاکید ہے عموماً ابتداءِ کلام میں آتا ہے:- اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ۲/۶ = بیشک جو لوگ ضابطۂ خداوندی کا انکار کرتے ہیں۔ اُنہیں آخرت کے عذاب

سے ڈرانا یا نہ ڈرانا برابر ہے۔

اِنَّمَا، اِنَّ + مَا کا مرکب ہے۔ کلمہ حصر ہے بمعنی سوائے اِسکے اور کوئی بات نہیں۔

اِنَّا، اِنَّ اور نَا کا مرکب ہے۔ قرآن کریم میں اِنَّا اور اِنَّنَا دونوں صورتوں میں آیا ہے۔ بمعنی بیشک ہم۔

اِنِّیْ، اِنَّ اور ی کا مرکب ہے۔ اِنِّیْ اور اِنَّنِیْ دونوں صورتوں میں آیا ہے۔ بمعنی بیشک میں۔

اِنَّكَ۔ اِنَّكُمْ وغیرہ ایک ہی صورت میں آتے ہیں۔ بمعنی بیشک تو، بیشک تم۔

۳۱/۱۶ — اَنّٰی کے مختلف استعمالات یہ حرف استفہام ہے۔ متعدد معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۔ اَنّٰی بمعنی کس طرح:۔ اَنّٰی یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ۶/۱۰۱ = اللہ کا بیٹا کس طرح ہو سکتا ہے۔ جبکہ اُسکی بیوی ہی کوئی نہیں۔

۲۔ اَنّٰی بمعنی کہاں سے:۔ اَنّٰی لَكِ هٰذَا ۳/۳۷ = (اے مریم!) تجھے یہ رزق کہاں سے ملا ہے۔

۳۔ اَنّٰی بمعنی کدھر کو:۔ فَاَنّٰی تُؤْفَكُوْنَ ۶/۹۵ = پھر تم کدھر کو اُلٹے پھر رہے ہو۔

۴۔ اَنّٰی بمعنی جب:۔ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰی شِئْتُمْ ۲/۲۲۳ = تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ ممنوعہ اوقات یعنی حمل، حیض، بیماری، زچگی کے علاوہ، اپنی کھیتیوں کو جب چاہو آؤ۔

۳۱/۱۷ — استفہام اقراری اور انکاری حرف استفہام کے متعلق یہ واضح کرنا ضروری ہے کہ اگر اِن میں انکار مذکور ہو تو اقرار مقصود ہوتا ہے۔ اور اگر اقرار مذکور ہو تو انکار مقصود ہوتا ہے۔

۱۔ استفہام انکاری:۔ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۶۷/۳ = اے مخاطب! کیا تو کائنات میں کوئی کمی دیکھتا ہے — دیکھیگا؟ اگرچہ یہاں "دیکھتا ہے" کے مثبت الفاظ آئے ہیں لیکن متکلم کی غرض یہ بتانا ہے کہ تو کائنات میں ہرگز کوئی کمی **نہیں دیکھتا**۔

۲۔ استفہام اقراری:۔ اَلَیْسَ اللّٰهُ بِاَحْكَمِ الْحٰكِمِیْنَ ۹۵/۸ = کیا اللہ تعالیٰ حاکموں کا حاکم نہیں ہے؟ اِس جملہ میں اگرچہ "نہیں ہے" کے منفی الفاظ آئے ہیں، لیکن متکلم کی غرض یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ حاکموں کا حاکم ہے۔

یاد رہے کہ سورہ تحریم ۶۶/۱ میں یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَاۤ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ میں استفہام انکاری ہے جس سے سابقہ تفاسیر و تراجم نے آنحضورؐ کی طرف اللہ کے حلال کو حرام کرنا منسوب کر رکھا ہے۔ حالانکہ یہاں کہا گیا ہے کہ تو کیوں اللہ کے حلال کو حرام کریگا۔ یعنی تو کبھی نہیں کریگا۔

۳۱/۱۸ — اِنْ کے مختلف استعمالات اہل قواعد نے اسے شرطیہ ماننے کے علاوہ نافیہ اِس شرط پر مانا ہے کہ اِسکے بعد اِلَّا آیا ہو اور اِسے تاکیدیہ اِس شرط کیساتھ تسلیم کیا ہے کہ اگر اِس کا صلہ لام آئے۔ لیکن قرآن کریم میں اِنْ نافیہ بلا ورود اِلَّا بھی آیا ہے۔ اور اِنْ تاکیدیہ بمعنی اِنَّ بلا صلہ لام بھی آیا ہے۔ بالترتیب مثالیں ملاحظہ فرمائیں:۔

۱- اِنْ شرطیہ :- اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ○ ۱۰/۱۵ = اگر میں اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں تو بلاشبہ میں بھی بڑے دن کے عذاب سے خوف کھاتا ہوں۔

۲- اِنْ نافیہ با وُرُود اِلَّا :- اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ۶/۵۷ = اللہ کے سوا کسی کا حکم ہے ہی نہیں۔

۳- اِنْ نافیہ بِلا وُرُود اِلَّا :- اِنْ عِنْدَکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ بِھٰذَا ۱۰/۶۸ = تمہارے پاس اِسکی کوئی دلیل نہیں ہے۔

۴- اِنْ تاکیدیہ بمعنی بیشک صلہ لام کیساتھ :- وَاِنْ کُنْتَ مِنْ قَبْلِہٖ لَمِنَ الْغٰفِلِیْنَ ۱۲/۳ = اور بیشک تو اِس سے پہلے بے خبروں میں سے تھا۔ اس آئت میں لَمِنْ کی لام، حرف اِنْ کے صلہ کی لام ہے۔

۵- اِنْ تاکیدیہ بمعنی بیشک بغیر صلہ لام :- وَلَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۲۴/۳۳ = اور تم اپنی خادمہ عورتوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو، تاکہ تم دنیوی زندگی کا مال حاصل کرو۔ بیشک وُہ اِس سے بچنے کا ارادہ رکھتی ہیں — یہ تو ہے اِس آئت مجیدہ کا معنیٰ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا میں، اِنْ تاکیدیہ بمعنی اِنَّ، بیشک کی صُورت میں — لیکن چونکہ اِس آئت میں حرفِ اِنْ کا لام صلہ موجود نہیں۔ اِسلیئے جُملہ تراجم میں اِس آئت کا معنیٰ، اِسے اِنْ شرطیہ قرار دیکر یہ لکھا ہے:-
اگر تمہاری خادمائیں عصمت کو بچانے کا ارادہ کریں تو اُنہیں دُنیا کا مال حاصل کرنے کیلئے بدکاری پر مجبُور نہ کرو — اِس ترجمے پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ عصمت کو بچانے کا ارادہ نہ کریں تو کیا پھر اُنکی عصمت فروشی کا روبار کھول بیٹھنے کی اجازت دیدی گئی ہے؟ معاذ اللہ استغفر اللہ! — فلہذا ان دلائل قاطعہ کی رُو سے ثابت ہُوا، کہ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا ۲۴/۳۳ میں اِنْ بمعنی اِنَّ ہے۔ اور یہ جُملہ معترضہ کی صُورت میں عورتوں کی عام جبلّت کے اظہار کیلئے آیا ہے کہ وُہ تو بلاشبہ عصمت فروشی سے بچنا چاہتی ہیں تم دنیوی مال کیلئے اُنہیں عصمت فروشی کیلئے مجبور نہ کرو۔ چنانچہ آئت مجیدہ کے اگلے الفاظ میں کہا گیا ہے:- وَمَنْ یُّکْرِھْھُّنَّ فَاِنَّ اللّٰہَ مِنْۭ بَعْدِ اِکْرَاھِھِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ ۲۴/۳۳ = اور جو کوئی اُنہیں بدکاری پر مجبُور کرے۔ تو اُنکے مجبُور کیئے جانے کے بعد (اِس گناہ کا بوجھ مجبُور کرنے والوں پر ہوگا) مجبور کیگئی عصمت فروشوں کیلئے اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ فلہذا امر نمبر ۵ کیطرح ثابت ہُوا کہ اِنْ تاکیدیہ کا جب قرینہ موجود ہو اِسکا صلہ لام حذف ہوتا ہے۔

۱۹/۳۱ اَمْ کے مختلف استعمالات

۱- اَمْ بمعنی یا :- ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۷۹/۲۷ = کیا پیدائش کی رُو سے تم زیادہ سخت ہو۔ یا فضائی کرہ جات۔

۲- اَمْ بمعنی نیز :- قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الْاَعْمٰی وَالْبَصِیْرُ ۵ۙ اَمْ ھَلْ تَسْتَوِی الظُّلُمٰتُ وَالنُّوْرُ ۱۳/۱۶ = کہدے لے رسُول! کیا اندھا اور دیکھنے والا برابر ہوتے ہیں۔ نیز کیا اندھیرے اور روشنی برابر ہوسکتے ہیں۔

۳۔ **اَمْ زائدہ:**۔ اَمْ اَنَا خَیْرٌ مِّنْ ھٰذَا ..... ۴۳/۵۲ = میں اس سے بہتر ہوں۔

۳۱/۲۰ اَمَّا کے مختلف استعمالات یہ اَنْ اور مَا کا مرکّب ہے۔ استیناف کا فائدہ دیتا ہے۔ جو، جس اور یا کے معنوں میں آیا ہے:۔

۱۔ **اَمَّا بمعنی جو، جس:**۔ اَمَّا السَّفِیْنَۃُ ..... وَاَمَّا الْغُلٰمُ ..... وَاَمَّا الْجِدَارُ ۱۸/۷۹ تا ۸۲ = جو کشتی ہے اسکا قصہ یہ ہے ..... اور جو لڑکا ہے، اسکی حقیقت یہ ہے ..... اور جو دیوار ہے اسکا واقعہ یہ ہے۔

۲۔ **اَمَّا بمعنی یا:**۔ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَیْہِ اَرْحَامُ الْاُنْثَیَیْنِ ۶/۱۴۴ = یا وہ، جو دونوں مونثوں کے رحموں میں ہے

۳۱/۲۱ اِمَّا کے مختلف استعمالات دراصل یہ اِنْ اور مَا کا مرکّب ہے تکرار وارد ہُوا ہے۔ اِسکے متعدّد مفاہیم قرآن کریم میں آئے ہیں:۔

۱۔ **اِمَّا بمعنی یا:**۔ فَاِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً ۴۷/۴ = جنگی قیدیوں کو یا تو احسان کر کے آزاد کرنا ہے اور یا فدیہ لیکر آزاد کرنا ہے۔

۲۔ **اِمَّا بمعنی خواہ:**۔ اِمَّا شَاکِرًا وَّاِمَّا کَفُوْرًا ۷۶/۳ = خواہ شکر کرنیوالا ہو، اور خواہ انکار کرنیوالا ہو جائے۔

۳۔ **اِمَّا بمعنی اگر:**۔ فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا ۱۹/۲۶ = پھر اگر تُو کسی بشر کو دیکھے۔

۳۱/۲۲ بَعْدَ کے مختلف استعمالات یہ مادہ ب۔ع۔د سے مشتق ہے۔ بمعنی دُوری اور دُور ہونا۔ لیکن بطور حرف جار بھی استعمال ہوتا ہے بمعنے کے بعد۔ قرآن مجید میں بصورت حرف ذیل کے متعدد معنوں میں استعمال ہُوا ہے:۔

۱۔ **بعد بمعنی کے بعد:**۔ اَنَّہٗ مَنْ عَمِلَ مِنْکُمْ سُوْٓءًا بِجَھَالَۃٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِہٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّہٗ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ○ ۶/۵۴ = حقیقت یہ ہے کہ تم میں سے جو شخص نادانی کیساتھ کوئی ناروا کام کر بیٹھے۔ پھر اُس کے بعد اگر وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لے تو وہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

۲۔ **بعد بمعنی سوا:**۔ فَمَنْ یَّھْدِیْہِ مِنْ بَعْدِ اللّٰہِ ۴۵/۲۳ = پھر اللہ کے سوا اُسکی کون رہنمائی کر سکتا ہے۔

۳۔ **بعد بمعنی اِسکے باوجود:**۔ ذٰلِکَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَرَحْمَۃٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِکَ فَلَہٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ○ ۲/۱۷۸ = مذکورہ رعائتیں تیرے پروردگار کیطرف سے بطور تخفیف و رحمت ہیں۔ پھر اسکے باوجود جو کوئی سرکشی کریگا اُسکے لئے دردناک عذاب ہوگا۔

۳۱/۲۳ ذٰلِکَ کا قرآنی استعمال یہ اسم اشارہ واحد مذکر بعید ہے سلسلہ کلام میں آئے تو کسی دُور کی چیز کیطرف اشارہ کرنے کیلئے آتا ہے۔ مثلاً نزدیک پڑے ہوئے قلم کیلئے کہینگے ھٰذَا الْقَلَمُ۔ اور دُور پڑے ہوئے رجسٹر کیلئے کہا جاتا ہے۔ ذٰلِکَ الدَّفْتَرُ ـــــ لیکن جب ذٰلِکَ سلسلۂ تحریر میں آتا ہے، تو اُس سے مُراد ہوتی ہے

مذکورہ بالا۔ جیسے کہ قرآنِ کریم میں ذیل کی متعدد مثالیں موجود ہیں بنی اسرائیل کے متعلق آیا ہے :۔
وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاءُوْا بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
۲/۶۱ = اور اُن پر ذِلّت و مسکنت مسلّط کر دیگئی اور وُہ غضب الٰہی کے مستحق ہو گئے۔ مذکورہ بالا عذاب اُن پر اِسلئے واجب ہُوا کہ وُہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے۔
سورہ بقرکی آیت نمبر ۲۲۵ تا ۲۳۱ میں طلاق کے مسائل کی وضاحت کے بعد ارشاد ہُوا ہے :۔ ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ ۲/۲۳۲ = اللہ تعالیٰ مذکورہ بالا ہدایتوں کی نصیحت کرتا ہے اُسکے لیئے جو اللہ اور روزِ مکافات پر ایمان رکھتا ہے۔
نیز آیت نمبر ۲۴۱ تا ۲۴۸ میں حضرتِ طالوت کا جالوت کیساتھ جہاد کا ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہُوا ہے :۔ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○ ۲/۲۴۸ = بِلاشُبہ مذکورہ بالا بیان میں، اگر تم مومن ہو تو تمہارے لیئے ایک واضح نشان موجود ہے۔

۳۲- قواعد کی بحث

۳۲/۱ افعالِ ثلاثی مجرّد کا خاصہ وِجدان

قواعد کی رُو سے عربی افعال کی دو قسمیں ہیں، مجرد اور مزید فیہ۔
اہلِ قواعد نے مزید فیہ کے بعض ابواب کا خاصہ وِجدان تسلیم کیا ہے لیکن مجرّد افعال کا خاصہ وِجدان تسلیم نہیں کیا گیا لیکن واضح رہے کہ ترتیبِ قواعد محض بشری کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اور بشری کوششیں سہو و خطا سے منزّہ نہیں ہو سکتیں۔ سہو و خطا سے پاک خدا تعالیٰ اور اُسکی مقدّس کتاب قرآن کریم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہلِ قواعد اپنے مرتّب کردہ صرفی نحوی کُلیات کی صحت کی دلیل کیلیئے قرآنی آیات ہی لاتے ہیں۔ اور ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ کہ قواعد کی صحت کی دلیل آیاتِ قرآنیہ ہوں۔ فلہٰذا اہلِ قواعد کے اپنے تسلیم کردہ نظریہ کے مطابق، کہ گرامر کا ہر وُہ کلیہ صحیح ہے جس کی تائید قرآنی آیات کریمات کرتی ہوں۔ اور ہر وُہ کلیہ غلط ہے جو قرآنِ کریم کے خلاف ہو۔ اِس سلسلے میں ہم حروف کی بحث عنوان نمبر ۳۱/۸ میں اِنْ نافیہ اور اِنَّ تاکیدیہ کے متعلق عرض کر چکے ہیں کہ قرآنِ کریم میں اِنْ نافیہ بلا ورُودِ اِلّا بھی آیا ہے۔ اور بلا صلہ لام اِنْ بمعنی اِنَّ بھی آیا ہے۔ اِسی طرح واضح رہے کہ :۔
قرآنِ کریم کی آیاتِ مقدّسات سے ثابت ہوتا ہے کہ افعالِ ثلاثی مجرّد کا خاصہ وِجدان تسلیم کرنا لازم ہے۔ کیونکہ اگر ثلاثی مجرّد کا خاصہ وِجدان تسلیم نہ کیا جائے تو قرآنِ کریم میں تضاد و تخالف پایا جاتا ہے۔ اسکا بتایا ہُوا مکافاتِ عمل کا نظریہ بیکار محض ٹھہرتا ہے۔ اور خدا تعالیٰ ظالم اور غیر عادل ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ یٰسٓ میں ضابطۂ خداوندی کا انکار کرنیوالوں کے متعلق ارشاد ہُوا ہے :۔
لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ اِنَّا جَعَلْنَا فِىْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِىَ اِلَى الْاَذْقَانِ

فَھُمْ مُّقْمَحُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ○

۳۶/۹ تا ۷ ان آیات مقدسات کا مفہوم ہر ترجمہ اور تفسیر میں افعال ثلاثی مجرد کو خاصۂ وجدان سے تہی دامن مانکر یہ لکھا ہے:۔

بیشک ان میں سے اکثر پر عذاب کی بات واجب ہو چکی ہے پس وہ ایمان نہیں لائینگے۔ ہم نے اُنکی گردنوں میں طوق ڈالدیئے ہیں. پھر وہ طوق ٹھوڑیوں تک ہیں۔ پس وہ اپنے سر اُوپر کو اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور ہم نے اُن کے آگے بھی دیوار بنا دی ہے۔ اور اُنکے پیچھے بھی دیوار بنا دی ہے۔ پھر ہمنے اُنہیں ڈھانپ دیا ہے پس وہ نہیں دیکھتے۔

اب غور فرمائیگا کہ اس ترجمہ کی رُو سے، جن کے گلے میں اللہ تعالیٰ خود ایسا طوق ڈالدے جو ٹھوڑی تک پہنچکر اُس کو اُوپر کا اُوپر اُٹھا رکھے۔ مزید براں اُنکے آگے بھی دیوار کھینچ دیگئی ہو۔ اور پیچھے بھی دیوار کھینچکر اُوپر سے ڈھانپ دیا گیا ہو۔ اگر انہیں راہ ہدایت نظر نہ آئے تو ان بچاروں کا کیا قصور؟ اور مروجہ ترجمہ کی رُو سے سب کچھ خود کر چکنے کے بعد اگلی آیت کریمہ میں ارشاد ہوتا ہے:۔

وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ ۳۶/۱۰ = اور اے رسول! آپ اُن کو بُرے اعمال کے بُرے نتائج سے ڈرائیں یا نہ ڈرائیں وہ ایمان نہیں لائینگے۔ اِس پر سورۃ بقرہ میں ذیل کا مزید اضافہ موجود ہے:۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ ۲/۷ = ہم نے اُن کے ذہنوں پر اور اُنکے کانوں پر مہر لگا دی ہے۔ اور اُنکی آنکھوں پر پردہ ہے اور اُنکے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

ان بچاروں کا قصور کیا ہے؟

اب غور طلب امر یہ ہے کہ جب خدا تعالیٰ نے خود ہی ذہنوں اور کانوں پر مہر کر دی ہو، آگے پیچھے دیواریں کھینچکر اُوپر سے ڈھانپ دیا ہو۔ تو اس صورت میں اگر وہ نہ سُن سکنے اور نہ سوچ سکنے کے باعث راہ ہدایت کو قبول نہ کریں تو اُنکا کیا قصور؟ اور ہدایت سے خود محروم کردہ افراد کیلئے وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کا فیصلہ کہاں کا انصاف ہے؟ ـــ یہ وہ آیات کریمات ہیں جن کی رُو سے بڑے بڑے جید علماء برسرِ منبر کہہ دیتے ہیں کہ جسے اللہ تعالیٰ محرومِ ہدایت کر دے۔ اُسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا۔ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ۳۶/۹ کا مفہوم بھی یہی لیا جاتا ہے کہ جسے اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ـــ یاد رہے کہ خدا تعالیٰ کو گمراہ کرنیوالا، اور خود گمراہ کردہ کو عذاب دینے والا قرار دیکر ظالم ٹھہرانے میں صرف اس بشری سہو کا ہاتھ ہے، جو مجرد افعال کا خاصہ وجدان تسلیم نہیں کیا گیا۔ آیات بالا پر اگر معمولی سا غور کیا جائے تو یہ بات نکھر کر سامنے آرہی ہے کہ جس طرح ابواب مزید فیہ کا خاصہ وجدان تسلیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح افعال مجرد میں بھی خاصہ وجدان موجود ہے۔ ذیل میں آیات بالا کا ترجمہ اور مفہوم بصورتِ خاصۂ وجدان ملاحظہ فرمائیں۔ آپ دیکھینگے کہ کس طرح ہر اُلجھن کی گرہ کشائی ہو جاتی، اور ذات باری اس عظیم اعتراض سے بری ثابت ہوتی ہے جو مروجہ تراجم کی رُو سے عائد ہوتا، اور اُسے انتہائی ظالم ٹھہراتا ہے۔ پہلے آیات کریمات کا متن مع قرآنی مفہوم:۔

لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ اِنَّا جَعَلْنَا فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِيَ اِلَى الْاَذْقَانِ

فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ ○ وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ سَدًّا وَّمِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَيْنٰهُمْ فَهُمْ لَا
يُبْصِرُوْنَ ○ وَسَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ○ ٣٦/١٠-٧ = بیشک انکی اکثریت[١]
عذاب کا حکم وارد ہو چکا کیونکہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ بیشک ہم نے انکی گردنوں میں (غیر اللہ کی تقلید واطاعت[١] کے) طوق پڑے ہوئے پائے
ہیں[٢] (انہیں وہ خود اتارتے نہیں) پھر وہ طوق ان کی ٹھوڑیوں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اسلئے[٣] وہ سروں کو اوپر اٹھائے ہوئے ہیں۔
(یعنی ذاتی منفعت کوشیوں پر مشتمل، غیر اللہ کی اطاعت کے طوق انہیں ربوبیت عامہ سے محروم افراد یعنی نچلی سطح کے لوگوں
کیطرف دیکھنے ہی نہیں دیتے) اور ہم نے انکے سامنے بھی (عوام کش نظریات کی) ایک دیوار کھچی ہوئی پائی ہے اور انکے پیچھے
بھی ایک دیوار کھچی ہوئی پائی ہے[٤]۔ اور انہیں (انفرادی منفعت کوشیوں کے دبیز) پردوں میں ڈھکا ہوا پایا ہے[٥]۔ اسلئے[٦]
وہ نہیں دیکھتے۔ (اے رسول! ان حالات میں) انکے لئے برابر ہے کہ آپ انہیں ان کے اعمال کے خطرناک نتائج سے ڈرائیں
یا نہ ڈرائیں، ایسے لوگ ایمان نہیں لائینگے۔

اس سے آگے آیت مجیدہ ٢/٧ کا مفہوم افعال مجرد کے خاصہ وجدان کے قرآنی کلیہ کے مطابق ملاحظہ فرمائیں۔ آیت مجیدہ یہ ہے۔
خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ○ ٢/٧ = اللہ
نے انکے قلوب اور کانوں پر (ربوبیت کش نظریات کی) مہریں لگی ہوئی پائی ہیں[٧] اور ان کی آنکھوں پر (ربوبیت کش عقائد
کا) پردہ پڑا ہوا ہے[٨]۔ اسلئے وہ ضابطۂ ربوبیت پر ایمان نہیں لاتے) انکے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

---

[١] ١٥٧/٧ میں آیا ہے کہ رسولِ کریم بھی غیر اللہ کی تقلید واطاعت کے طوق اتارتے تھے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ
كَانَتْ عَلَيْهِمْ = وہ رسولِ عربی لوگوں کے وہ بوجھ یعنی وہ طوق اتارتے ہیں جو ان پر پڑے ہوئے ہیں، قرآن کریم اپنے الحمد للہ رب العٰلمین
کے اوّلین درس کے مطابق ربوبیت عامہ کا ایک ہی خدائی طوق پہناتا ہے۔ اسکے برعکس انفرادی منفعت کوشیوں کے غیر اللہ کی اطاعت کے
طوق لوگ خود پہن لیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہرگز نہیں پہناتا۔ [٢] "ہم نے انکی گردنوں میں طوق پڑے ہوئے پائے ہیں"۔ یہ خط کشیدہ الفاظ فعل
ثلاثی مجرد کے خاصہ وجدان کی رو سے متن میں آمدہ لفظ جَعَلْنَا کا معنی ہیں [٣] ٦٩٣ واؤ کا معنی ہے اسلئے۔ دلیل کیلئے دیکھئے حروف کی
بحث عنوان نمبر ٣ کی شق نمبر ٤ [٤] "ہم نے دیوار کھچی ہوئی پائی ہے"۔ خط کشیدہ الفاظ فعل ثلاثی مجرد کے قرآنی خاصہ وجدان کی رو سے
متن میں آمدہ لفظ جَعَلْنَا کا معنی ہیں [٥] اسی خاصہ کی رو سے "پس ہم نے انہیں ڈھکا ہوا پایا ہے"۔ یہ متن میں آمدہ فَاَغْشَيْنٰهُمْ کا معنی ہے
یہاں اَغْشٰی فعل مزید فیہ باب افعال سے ہے۔ جس کا خاصہ نسبت بماخذ اہل قواعد نے پہلے ہی تسلیم کیا ہوا ہے جو وجدان ہی کے مترادف ہے۔ [٦]
"اللہ نے ..... مہریں لگی ہوئی پائی ہیں"۔ یہ خَتَمَ فعل ثلاثی مجرد کے خاصہ وجدان کی رو سے متن میں آمدہ الفاظ خَتَمَ اللّٰهُ کا معنی ہے۔ [٨] "اور انکی آنکھوں
پر پردہ پڑا ہوا ہے" یہ معنی ہے "وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ" کا۔ یہ جملہ اسمیہ خبریہ ہے۔ اسکا جو معنی ہم نے لکھا ہے۔ ترکیب نحوی کیمطابق سو فیصدی صحیح
ہے۔ اور اللہ تعالیٰ سابقہ تراجم کے اس الزام سے سو فیصدی بری ہے کہ وہ خود ہی لوگوں کے قلوب و اذہان اور کانوں پر مہریں لگا کر انکی آنکھوں پر پردہ
ڈالکر انکے آگے پیچھے دیواریں کھینچکر خود گمراہ کرتا ہے اور خود ہی انہیں عذاب الیم کی وعید سناتا ہے۔

دیکھا آپنے کہ:- قرآنی رہنمائی کے مطابق مجرد افعال کا خاصہ وجدان تسلیم کرنے سے اِس خاصہ کے ترک کی بدولت ذات باری پر وارد شدہ بڑے بڑے اعتراضات کے کوہِ گراں کس طرح چشم زدن میں پاش پاش ہو چکے ہیں۔ اب نہ خدا تعالیٰ ظالم ٹھہرتا ہے۔ کہ خود ہی آگے پیچھے دیواریں بھی کھینچتا ہے اور عذابِ عظیم کی وعید بھی سناتا ہے اور نہ قرآن کریم میں تضاد و تخالف ثابت ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ ایک طرف تو لَا یَظْلِمُ النَّاسَ کا اعلان کرتا ہے۔ کہ اللہ بندوں پر ظلم نہیں کرتا۔ اور دوسری طرف خود قلوب و اذہان پر مہریں لگا دیتا ہے کہ وہ ضابطۂ خداوندی پر ایمان نہ لاسکیں۔ اور عذابِ الٰہی کے مستحق ٹھہریں۔ العیاذ باللہ!

۳۲/۲- فعل ماضی مضارع کے معنوں میں: اہلِ قواعد نے تسلیم کیا ہے کہ کیا وہ صورتوں میں ماضی مضارع کا فائدہ دیتی ہے۔ اور اِس پر قرآنی آیات مقدسات ہی کو بطور دلیل پیش کیا ہے :-

۱- عطف ماضی بر مضارع :- وَیَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلًا ۲۵/۲۷ = اور ظالم ہاتھ کاٹ کھائیگا۔ کہیگا کاش کہ میں اللہ کے رسول کیساتھ اپنا راستہ بناتا۔ یہاں یَقُوْلُ فعل مضارع ہے جس پر قَالَ ماضی کا عطف آیا ہے۔ اور وہ مضارع بن گیا ہے :- وَقَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۲۵/۳۰ = اور رسول مقبول کہینگے کہ اے میرے پروردگار، میری اِس قوم نے قرآن کو اِس طرح پکڑا ہوا تھا جس طرح چھوڑا ہوا ہوتا ہے۔

۲- ابتدائے کلام میں :- ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلَیْنِ ۱۶/۷۶ = ضَرَبَ فعل ماضی ابتدائے کلام میں آکر مضارع بن گئی ہے = اللہ دو مردوں کا حال بیان کرتا ہے۔

۳- اسمِ موصول کے بعد آئے :- اِنَّ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِیْ شَیْءٍ ۶/۱۵۹ = اَلَّذِیْنَ اسم موصول کے بعد فَرَّقُوْا فعل ماضی آیا ہے۔ اسلئے مضارع بن گیا ہے = بیشک جو لوگ اپنے دین میں تفریق پیدا کرکے فرقے فرقے ہو جائینگے۔ اے رسول! آپکا اُنکے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

۴- ندا کے بعد :- یٰاَیُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ ۲۲/۷۳ ضُرِبَ فعل ماضی یٰاَیُّهَا حرفِ ندا کے بعد آیا ہے اسلئے مضارع بن گیا ہے :- لوگو! ایک مثال بیان کی جاتی ہے۔ اسے غور کیساتھ سُننا۔

۵- لفظ حَیْثُ کے بعد :- وَاقْتُلُوْهُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۲/۱۹۱ = ثَقِفْتُمُوْ فعل ماضی حَیْثُ کے بعد آیا ہے اسلئے مضارع کا فائدہ دیتا ہے یعنی = تم ملک کے باغیوں کو جہاں پاؤ انہیں قتل کردو۔

۶- لفظ کُلَّمَا کے بعد :- کُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ۷/۳۸ = جب بھی کوئی جماعت جہنم میں داخل ہوگی، اپنے جیسی جہنمی جماعت پر لعنت کریگی۔

۷- شرط، جزا اور ہر دو پر عطف :- وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْکِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَکَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ ۵/۶۵

وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۵/۶۵ - اِس آئت مجیدہ میں اٰمَنُوْا، اتَّقَوْا، كَفَّرْنَا اور اَدْخَلْنَا چاروں فعل ماضی ہیں۔ پہلا اور تیسرا چونکہ حرفِ شرط لَوْ کی بالتّرتیب شرط اور جزا ہیں - اور دُوسرا، چوتھا چونکہ بالتّرتیب اُنکے معطوف ہیں۔ اسلئے مضارع کا فائدہ دیتے ہیں۔ اور آئت مجیدہ کا معنی یہ ہے کہ:- اگر اہل کتاب ایمان لے آئیں۔ اور قانونِ خداوندی کی مخالفت سے بچیں توہم اُنکی بدحالیاں دُور کردینگے۔ اور نعمتوں والے باغات میں داخل کرینگے۔

۱۱- جملہ دعائیہ میں:- وَسِيْقَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَى الْجَنَّةِ زُمَرًا حَتّٰۤى اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ ۳۹/۷۳ = جو لوگ اپنے ربوبیّت کرنیوالے کے ضابطہ ربوبیّت کی مخالفت سے بچتے ہیں، قیامت کے دن جنّت کیطرف گروہ درگروہ بھیجے جائینگے۔ جب وہ جنّت پر پہنچینگے۔ اور اُنکے لئے اُسکے دروازے کھولے جائینگے تو جنّت کا خازن کہیگا تم پر سلامتی ہو۔ تم خوش رہو۔ طِبْتُمْ فعل ماضی ہے جو دُعائیہ انداز میں آکر مضارع بن گیا ہے۔

۳۲/۳ فعل مضارع ماضی کے معنوں میں | جس طرح فعل ماضی بعض صورتوں میں مضارع کا فائدہ دیتا ہے اسیطرح فعل مضارع بعض صورتوں میں ماضی کا فائدہ دیتا ہے:-

۱- ماضی کا قصّہ بیان کرتے ہوئے:- وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى الْاَرْضِ يَتَبَوَّاُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَآءُ ۱۲/۵۶ = اور مذکورہ بالا طریقے سے ہم نے یوسفؑ کو سرزمینِ مصر میں اقتدارِ ارضی عطا فرمایا۔ وہ یہاں چاہتا تھا قیام کرتا تھا۔ دیکھئے! یہاں يَتَبَوَّاُ اور يَشَآءُ دونوں فعل مضارع ہیں لیکن چونکہ زمانہ ماضی کا قصّہ یوسفؑ بیان کرنے میں وارد ہوئے ہیں۔ اسلئے ماضی کا فائدہ دیتے ہیں۔ ایسے افعال مضارع کو مضارع حکائی کہتے ہیں۔

۲- مضارع کا عطف ماضی پر:- وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوْۤا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُوْنَ ۱۲/۱۰۲ = اے رسولؐ! جس وقت یوسفؑ کے بھائی اُسکے خلاف اپنی مہم پر اکٹھے ہوئے اور وہ بُری تجویز کر رہے تھے، اُسوقت آپ ان کے پاس موجود نہیں تھے۔ يَمْكُرُوْنَ فعل مضارع کا عطف چونکہ اَجْمَعُوْا فعل ماضی پر آیا ہے۔ اسلئے ماضی بن گیا ہے۔ نیز اگر مضارع فعل ماضی کے ماتحت آئے تو بھی ماضی کا فائدہ دیتا ہے۔ خواہ عطف مذکور ہو خواہ نہ ہو۔

۳- مضارع پر لَمْ داخل ہو:- لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا ۱۷/۱۱۱ = اللہ تعالیٰ نے بیٹا نہیں بنایا۔ يَتَّخِذْ فعل مضارع پر لَمْ داخل ہونے سے مضارع ماضی منفی بن گیا ہے۔

۳۲/۴ خدا تعالیٰ قیدِ مکان و زمان سے منزہ ہے | عربی بلکہ ہر زبان کی گرامر میں ماضی، حال اور استقبال تین زمانے تسلیم کئے گئے، اور سلسلۂ کلام میں متکلّم، حاضر اور غائب کا لحاظ لازم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن قواعد کی بحث میں قرآن فہمی کیلئے اِس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ خدا تعالیٰ چونکہ قیدِ مکان و زمان سے آزاد ہے۔ اسلئے ایک ہی آئت مجیدہ میں اپنے لئے بانداز ذیل متکلّم کے صیغے بھی لاتا ہے، اور غائب کے بھی:-

وَهُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَیْءٍ ۶/۹۹ = وہ اللہ ہی ہے جو بلندی سے پانی نازل کرتا ہے پھر ہم اسکے ساتھ ہر چیز کی نباتات نکالتے ہیں —— دیکھئے یہاں اپنے لئے پہلے غائب کا صیغہ استعمال کیا ہے اَنْزَلَ اور متصل ہی متکلم کا صیغہ لایا گیا ہے اَخْرَجْنَا۔

اسی طرح ایک ہی آیت میں اپنے لئے باندازِ ذیل مخاطب کا صیغہ بھی لایا جاتا ہے اور غائب کا بھی:۔ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ○ ۳/۹۔ دیکھئے! یہ راسخون فی العلم کی دعا ہے، جسے اپنے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اس میں پہلے اپنے لئے اِنَّكَ ضمیر مخاطب لائی گئی ہے۔ اور پھر غائب کا صیغہ آیا ہے اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ —— حالانکہ اندازِ کلام کے مطابق ہونا چاہیئے اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ۔ پس قرآن فہمی کیلئے اسلوب قرآنیہ کے ضمن میں یاد رکھیئےگا۔ چونکہ اللہ تعالیٰ قیدِ زمان و مکان میں مقید نہیں ہے۔ اسلئے اپنے لئے حاضر، غائب اور متکلم تینوں صیغے لائے جاتے ہیں۔

۳۲/۵۔ کلماتِ حصر

قرآن کریم میں حصر کے متعدد طریقے مذکور ہیں:۔

۱۔ **حصر بذریعہ نفی اثبات**:۔ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۴۷/۱۹ = نہیں ہے کوئی بھی الٰہ موجود سوائے اللہ کے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ۶/۵۷ + ۱۲/۴۰ = نہیں ہے حکم کسی کا سوائے حکم اللہ کے —— قرآن کریم میں یہ چوٹی کا حصر ہے، جسکے ساتھ خدا تعالیٰ نے اپنی وحدت کی وضاحت فرمائی ہے کہ شرک فی الحکم بھی شرک فی الذات ہی کے برابر ہے۔ چنانچہ شرک کے متعلق فیصلہ دیدیا ہے کہ ہرگز ہرگز معاف نہیں کیا جائیگا:۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۴/۴۸ + ۴/۱۱۶

۲۔ **حصر بذریعہ اِنَّمَا و اَنَّمَا**:۔ قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۱۸/۱۱۰ = اے رسول کہدیجیئگا سوائے اسکے اور کوئی بات نہیں (یعنی سو فیصدی صحیح امر یہ ہے) کہ میں تمہارے جیسا ہی ایک بشر ہوں —— قرآنی قواعد میں یہ حصر بھی انتہائی محکم مانا گیا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اہلِ اسلام کے بعض گروہوں کا آنحضور سلام علیہ کو بشر تسلیم نہ کرنا، اِنَّمَا کے محکم حصر کو بیکار کر کے صرف آنحضور کے حصارِ بشریت ہی کو نہیں توڑ دیتا، بلکہ اس سے خدا تعالیٰ کی الوہیت بھی معاذ اللہ مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔ کیونکہ اسی آیت کے اگلے الفاظ میں ارشاد ہوا ہے:۔ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۱۸/۱۱۰ = سوائے اسکے اور کوئی بات نہیں کہ تمہارا الٰہ الٰہِ واحد ہے —— دیکھئے! جس حصر کیساتھ آنحضور کی بشریت کا اعلان کیا گیا ہے۔ اسی کیساتھ خدا تعالیٰ کی الوہیت بیان ہوئی ہے۔ پس جبکہ خدا تعالیٰ کا حصارِ الوہیت ہرگز ہرگز نہیں ٹوٹ سکتا۔ اسلئے آنحضور کے حصارِ بشریت میں بھی شگاف ممکن نہیں۔

۳۔ **حصر بذریعہ ضمیر مقدم**:۔ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۱/۴ = اے اللہ ہم صرف تیری ہی فرمانبرداری کرتے ہیں اور صرف تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں —— قرآنی قواعد میں ضمیر مقدم کے حصر کو بھی نفی اثبات اور اِنَّمَا کے برابر کا درجہ حاصل ہے

یہ اسلئے :-

کیونکہ جسطرح اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ میں اطاعت و فرمانبرداری کو نفی اثبات کے ذریعہ صرف خداتعالیٰ کے لئے مختص کر دیا گیا ہے اُسی طرح ضمیر مقدّم کے حصر اِیَّاکَ نَعْبُدُ میں بھی اکیلے خداتعالیٰ کی فرمانبرداری کا اقرار لیا گیا ہے۔ اسی طرح ضمیر مقدّم ھُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۱۱۲/۱ میں احدیّت کو صرف اللہ ہی کیلئے مختص کیا گیا ہے۔

۴۔ حصر بذریعہ جار مجرور مقدّم :- لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ۴/۱۳۱-۱۳۲ = آسمانوں اور زمین میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اللہ تعالیٰ ہی کی ملکیت ہے ـــ یہ حقیقت کسی فرد و بشر سے مخفی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی اس ملکیت میں غیر اللہ کا ہرگز ہرگز اشتراک نہیں ہے ـــ افسوس ہے کہ اس حصر ہی کو نظرانداز کرنے کا نتیجہ ہے کہ غیر متوازن تقسیم رزق کو خدائی تقسیم تسلیم کر لیا گیا ہے۔ حالانکہ جب خداتعالیٰ نے حصر کیساتھ اعلان کر رکھا ہے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز میری ہے، تو اُنکی ملکیت پر ضروریات سے زائد انسانی ملکیّت کا تصوّر کس طرح پیدا ہو سکتا ہے؟

۳۳۔ تنوین عہدی ذکری، اور تنوین عوض مضاف یا عوض مضاف الیہ

عربی قواعد میں الف لام عہدی ذکری، اور بدل الاضافت کے علاوہ اگرچہ تنوین عہدی ذکری، اور بدل الاضافت بھی مسلّم ہے۔ لیکن عام تراجم میں تنوین کے اِن اوصاف کا لحاظ بہت کم رکھا گیا ہے۔ قرآن فہمی کیلئے جسطرح الف لام کے مذکورہ اوصاف کا لحاظ رکھنا لازم ہے، اُسی طرح تنوین کے مذکورہ اوصاف کو بھی ذہن نشین کرنا ضروری ہے۔

یعنی جس طرح ۱۲/۵۰ میں فَلَمَّا جَآءَهُ الرَّسُوْلُ میں، الرَّسُول کا الف لام عوض مضاف الیہ ہے۔ مضاف الیہ الملک ہے اور الرّسول سے مُراد رسولُ الملک ہے، رسولُ اللہ نہیں۔ اسی طرح ۶۱/۶ میں مُبَشِّرًا بِرَسُوْلٍ کے لفظ رسُولٍ کی تنوین، عوض مضاف الیہ ہے۔ اور رسُولٍ سے مراد رسُول اللہ ہے۔

نیز جس طرح فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۲/۱۸۵ میں الشَّهْرَ کا الف لام عہدی ذکری، اور اس سے مراد رمضان کا مہینہ ہے کیونکہ اسی آیت میں الشّہر کا نام ماقبل مذکور ہے شَهْرُ رَمَضَانَ ـــ اسی طرح تنوین عہدی ذکری بھی آتی ہے ۵/۲ میں اُس قوم کا ذکر کر کے، جس نے مسلمانوں کو مسجدِ حرام سے روک دیا تھا صحابہ کو حکم دیا گیا ہے کہ اقتدار میسّر آنے پر اُنکی دشمنی تمہیں اِس چیز کا مُجرم نہ بنا دے کہ تم اُن سے انصاف نہ کرو۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ...... الخ ۵/۲ - اور ۵/۸ میں اُسی قوم کیلئے تکرار تاکید کے طور پر ارشاد ہوا ہے :- وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ـــ یہاں قَوْمٍ کی تنوین عہدی ذکری ہے، یعنی وہ قوم جس نے مسجدِ حرام سے روک دیا تھا۔

۳۴۔ بسم اللہ شریف بھی قرآن کریم کی آیت ہے

بسم اللہ شریف کے متعلق یہ تصوّر غلط ہے کہ یہ قرآن مجید کی آیت نہیں۔ بلکہ ۹/۱۵ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا ... کے خداوندی دعویٰ

کے مطابق بسم اللہ شریف بھی قرآن کریم کا حصّہ ہے۔ نزولی ہے اضافی نہیں۔ اور قرآن کریم ہی کی آیت مجیدہ ہے۔

بسم اللہ شریف بظاہر جملہ ناقص ہے تام نہیں

غیر مسلموں کا قرآن کریم پر اعتراض ہے کہ اسکا بالکل ابتدائی جملہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، نامکمل فقرہ ہے۔ کیونکہ جملہ مکمل ہوتا ہے فاعل فعل و مفعول کیساتھ۔ لیکن اس میں سے فعل ہی غائب ہے۔ غور فرمائیں بسم اللہ شریف کے پانچ لفظ ہیں:۔ بِ، اِسم، اللہ، رحمان اور رحیم۔ ب حرفِ جار ہے۔ اسم، اسم نکرہ ہے۔ اللہ اسم علَم ہے۔ رحمان اور رحیم دونوں اسم صفت ہیں۔ اب چونکہ اس جملے میں فعل کوئی نہیں۔ اسلئے گرامر کی رُو سے یہ جملہ ناقص ہے تام نہیں لیکن ترکیب نحوی اور قواعد عرب کا قاعدہ کلیہ ہے کہ جہاں فعل مذکور نہ ہو وہاں جار مجرور، فعل محذوف کے متعلق ہوتا ہے۔ اور قرآن کی رُو سے فعل محذوف خود بخود نکھر کر عیاں ہو جاتا ہے۔ جملہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کا فعل محذوف ترکیب نحوی میں ملاحظہ فرمائیں۔

• بِ حرف جار ہے۔ • اسم مجرور ہے، اپنے ماقبل مذکور حرفِ جار، ب کا۔ اور مضاف ہے، اپنے مابعد مذکور لفظ اللہ کا۔ • اللہ مضاف الیہ ہے اپنے ماقبل مذکور لفظ اسم کا، اور موصوف ہے، اپنے مابعد مذکور ہر دو الفاظ رحمان و رحیم کا۔ • رحمان اور رحیم دونوں صفتیں ہیں اپنے موصوف اللہ کی ——— اللہ موصوف اپنی ہر دو صفات رحمان اور رحیم کیساتھ مِل کر مضاف الیہ ہوا اپنے مضاف اسم کا۔ مضاف مضاف الیہ مِل کر مجرور ہوئے ب کے۔ اور جار مجرور مِل کر متعلق ہوئے فعل محذوف کے۔ اب قرآن کریم کی ابتداء ہی میں بسم اللہ شریف میں فعل محذوف کے بعد چونکہ مذکور ہے "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ" اور چونکہ جملہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ صرف کہنے یا پڑھنے کی چیز ہے۔ اسلئے یہاں فعل محذوف قُل یا اِقْرَأ روز روشن کیطرح نکھر کر عیاں ہو رہا ہے۔ یعنی پڑھ تو اے رسولؐ! ۔ یا کہہ تو اے رسولؐ! ۔ اعلان کر دے تو اے رسولؐ! کہ پوری کی پوری حمد و ستائش اللہ تعالیٰ کیلئے ہے جو تمام عالمین کیلئے سامان ربوبیّت پیدا کرنیوالا ہے۔

اس سے آگے اُس حکمت بالغہ کیطرف غور فرمائیں، کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں فعل مذکور کیوں نہیں لایا گیا، محذوف کیوں رکھا گیا ہے؟ یاد رہے کہ بسم اللہ شریف وُہ پاکیزہ جملہ ہے کہ ہر کام اسکے ساتھ شروع کیا جاتا ہے۔ لہٰذا اس میں فعل محذوف اسلئے رکھا گیا ہے کہ ہر موقع اور مقام پر الگ الگ افعال محذوف خود بخود متصوّر ہوتے چلے جائیں۔ مثلاً آنحضور پر جب یہ جملہ نازل ہوا تو مفہوم تھا "پڑھ یا کہہ الحمد للّٰہ رب العلمین۔ اور جب حضورؐ نے اس حکم کی تعمیل فرمائی تو محذوف نکلا "میں پڑھتا ہوں، میں کہتا ہوں، اعلان کرتا ہوں الحمد للّٰہ ربّ العلمین" ——— اب چونکہ ہر کام کی ابتداء بسم اللہ شریف سے ہوتی ہے، اسلئے جب ہم کھانا کھاتے وقت بسم اللہ پڑھتے ہیں تو مفہوم ہوتا ہے "میں کھاتا ہوں اللہ رحمان و رحیم کے نام کیساتھ" ——— جب مشروبات کے استعمال پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے تو مفہوم ہوتا ہے "پیتا ہوں اللہ رحمان رحیم کے نام کیساتھ" ——— جب عورتیں بسم اللہ پڑھکر مختلف کام کرتی ہیں یعنی آٹا گوندھتی ہیں، دُودھ بلوتی ہیں، مکھن نکالتی ہیں، روٹیاں پکاتی ہیں، تو ہر مقام پر الگ الگ مفہوم ہوتے ہیں۔ کہ "آٹا گوندھتی ہوں اللہ رحمان رحیم کے نام کیساتھ۔ دُودھ بلوتی ہوں اللہ رحمان و رحیم کے نام کیساتھ۔ مکھن نکالتی ہوں اللہ رحمان

رحیم کے نام کیساتھ۔ علیٰ ہذا القیاس۔

۳۳۔ جمع القرآن

۳۳-۱ جمع قرآن تفاسیر کے آئینے میں

قرآن فہمی کے راستے میں ایک بڑی رکاوٹ یہ عقیدہ بھی ہے جو قرآن کریم کے متعلق مسلمانوں کو ورثتاً ملتا چلا آرہا ہے کہ جب رسول اکرم کی وفات ہوئی تو قرآن کریم ابھی کتابی شکل میں نہیں آیا تھا۔ بلا ترتیب پراگندہ صورت میں ہڈیوں، پتوں اور چمڑے کے ٹکڑوں پر لکھی ہوئی کچھ آیتیں کسی صحابی کے پاس تھیں اور کچھ آیتیں کسی کے پاس[۱]۔ آخر جب جنگ یمامہ میں بہت سے حافظ شہید ہو گئے، تو حضرت ابوبکرؓ نے حکم دیا کہ قرآن کو جمع کیا جائے۔

چنانچہ حضرت عثمانؓ کو قرآن کریم کے جمع وترتیب کی خدمت سپرد کیگئی۔ انہوں نے اپنی نگرانی میں یہ کام حضرت زیدؓ سے کروایا۔ جنہوں نے انتہائی عرق ریزی کیساتھ آئت آئت کر کے جمع کیا لیکن جب اسطرح تلاش بسیار کے بعد قرآن کریم جمع ہو گیا تو حضرت زیدؓ کا کہنا ہے، کہ دو آئتیں کم تھیں۔ ایک آئت سورہ توبہ کی اور ایک سورہ احزاب کی۔ جو مزید تلاش کے بعد حضرت خزیمہ بن ثابت انصاری کے گھر سے ملیں[۲]۔

۳۳-۲ قرأت کے اختلافات تفاسیر کی رُو سے

یہ تو ہوئی روایات کی رُو سے جمع القرآن کی صورت! اب اسکی قرأت کی حالت ملاحظہ فرمائیں:-

قرآن کریم کی قرأت کے متعلق یہ تصوّر دیا گیا ہے کہ رسول اکرم کے زمانے میں قبیلے قبیلے کی قرأت قرآن میں بھی اختلافات موجود تھے۔ چنانچہ جب اپنے دورِ خلافت میں حضرت عثمانؓ، صحیفۂ حفصہؓ سے نقل کروانے لگے۔ تو حضرت زیدؓ بن ثابت، عبداللہؓ بن زبیرؓ، سعیدؓ بن عاص اور عبدالرحمٰن بن حارث بن ہشام کو حکم دیا تو ان لوگوں نے اس کو مصاحف میں نقل کیا۔ اور حضرت عثمانؓ نے ان تینوں قریشیوں کو کہا کہ جب تم میں اور زیدؓ بن ثابت میں کہیں (قرأتِ) قرآن میں اختلاف ہو تو اسکو قریش کی زبان میں لکھو۔" (بخاری شریف مترجم مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد دوم صفحہ ۹۹۰-۹۹۱)

---

[۱] ہمارے اس بیان پر قرآن محل کراچی کی مطبوعہ مترجم بخاری شریف جلد دوم صفحہ ۹۸۹ سطر ۲۷-۲۹ پر حضرت زید صحابی کیطرف منسوب کردہ یہ الفاظ شاہد ہیں کہ وہ "حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے کہا کہ تم ایک جوان آدمی ہو۔ تم کو ہم بھی نہیں کر سکتے اور تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے وحی لکھتے تھے۔ اسلئے قرآن کو تلاش کر کے جمع کرو۔" [۲] اس بیان کی تصدیق مذکورہ بخاری شریف جلد دوم کے صفحہ ۹۹۰ پر موجود ہے۔

(باقی برصفحہ ۱۱۴)

۳۳/۳ اعراب کا اختلاف

محترم مودودی صاحب نے ترجمان القرآن جون ۱۹۵۹ء کے صفحہ ۴۵ پر لکھا ہے کہ:۔ ”جس رسم الخط میں ابتداً نبی صلعم نے وحی کی کتابت کرائی تھی۔ اور جس میں حضرت ابوبکرؓ نے پہلا مصحف مرتب کرایا، اور حضرت عثمانؓ نے جس کی نقل بعد میں شائع کرائی اُسکے اندر نہ صرف یہ کہ اعراب نہ تھے۔ بلکہ نقطے بھی نہیں تھے کیونکہ اُس وقت یہ علامات ایجاد نہ ہوئی تھیں“۔ آپنے لکھا ہے کہ اعراب اور نقطے، دورِ بنو امیّہ میں حجاج بن یوسف نے لگوائے تھے۔ بالفاظِ دیگر تاثر یہ دیا گیا ہے۔ کہ زمانۂ رسالت وخلافت میں ہر قبیلہ اپنی اپنی منشاء کے اعراب اور اُنکے نقطے پڑھا کرتا تھا العیاذ باللہ! لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب اعراب اور نقطے، جو قرأت کے اختلافات کو ختم کرنے کا واحد ذریعہ ہیں، حضرت عثمانؓ نے اِن کے بغیر قرأت کے اُس مشہور ومعروف اختلاف، جس کی بناء پر آج بھی ایک فرقہ وضو میں پیروں کو دھوتا ہے اور ایک مسح کرتا ہے، کو قریش کی زبان میں اَرْجُلَكُمْ لکھوایا تھا یا اَرْجُلِكُمْ۔ جبکہ اعراب ونقاط کے بغیر اِس لفظ کی شکل یہ ہے ”ارحلکم“
المختصر! اقتباسات بالا سے واضح ہُوا کہ مروّجہ تفاسیر کی رُو سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول اکرمؐ نے قرآن کریم کو کتابی شکل نہیں دی تھی۔ آپ نے اپنے زمانے میں کچھ کاتبوں سے وحی کی کتابت کروائی تو تھی۔ لیکن اُسکی شکل یہ تھی کہ وہ ہڈیوں پتوں اور پتھروں پر لکھی ہوئی پراگندہ صورت میں مختلف صحابہ کے ہاں پڑی ہوئی تھی۔ جسے حضرت عثمانؓ نے زیدؓ بن ثابت کے ذریعہ تلاش کروا کر جمع کیا۔۔۔ لیکن قرآن کریم اِس نظریئے کا مطلقاً قائل نہیں۔ وُہ نہیں مانتا کہ وہ زمانۂ رسالت میں ہڈیوں، پتوں اور پتھروں پر لکھا ہُوا پراگندہ اور بے ترتیب صورت میں پڑا ہُوا تھا۔

۳۳/۴۔ قرآن کہتا ہے کہ وُہ زمانۂ رسالت میں صحیح کتابی صورت میں باریک کھُلی کے کاغذوں پر سطروار لکھا ہُوا تھا

ارشاد باری ہے:۔
وَالطُّوْرِ ۙ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۙ فِیْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۙ ۵۲/۱تا۳

(مفہوم) اُس کتاب کی شہادت ہے جو طور پر الواح میں لکھی گئی تھی ۷/۱۴۵ = اور اس کتاب کی شہادت ہے جو کھُلی کے کُشادہ کاغذوں پر سطروار لکھی ہوئی ہے ۔۔۔ اب بتایئے! قرآن کریم کی اس واضح شہادت کے بعد کیا یہ چیز تسلیم کی جاسکتی ہے کہ سرور عالمؐ کے زمانے میں قرآن کریم ہڈیوں اور پتوں پر لکھا جاتا تھا۔ اور کیا ہڈیوں یا پتوں کے بھرے ہُوئے ٹوکرے یا بوری کو کتاب کہا جاسکتا ہے؟

۳۳/۵۔ قرآن کریم کو خود رسول کریمؐ اپنے دستِ مبارک سے لکھا کرتے تھے۔

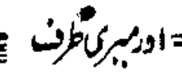
ارشاد باری ہے:۔

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۱۳:۔ حضرت زیدؓ کہتے ہیں:۔ میں نے قرآن کو کھجور کے چھلوں، پتھر کے ٹکڑوں اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ سورہ توبہ کی آخری آیت میں نے ابو خزیمہ انصاری کے پاس پائی۔ صفحہ ۹۹ پر حضرت زیدؓ ہی کی طرف منسوب کردہ الفاظ ہیں:۔ میں نے مصاحف کو نقل کرتے وقت سورہ احزاب کی ایک آیت نہ پائی۔۔۔ ہم نے اُسے تلاش کیا تو وہ آیت مجھے حضرت خزیمہؓ بن ثابت انصاری کے پاس ملی۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ○ ۲۹/۴۸ =
(مفہوم) اے رسولؐ! آپ اِس کتاب قرآن کریم کے نزول سے پہلے نہ کسی کتاب کو پڑھا کرتے تھے۔ اور نہ کسی کتاب کو اپنے داہنے ہاتھ سے لکھا کرتے تھے۔

غور فرمائیگا! کہ اِس آیت مجیدہ میں آپکے متعلق عدم تلاوت اور عدم کتابت دونوں چیزوں کا تصوّر معطوف علیہ کی صورت میں نزولِ قرآن سے پہلے کے متعلق دیا گیا ہے، جس سے بالصّراحت ثابت ہوا کہ رسولِ اکرم اِس کتاب قرآن کریم کے نزول کے بعد اِس کو پڑھا بھی کرتے تھے اور داہنے ہاتھ سے لکھا بھی کرتے تھے۔

۳۳/۶ ۔ قرآنِ کریم کا نسخۂ امام اور حضورؐ کے اپنے دستِ مبارک کا لکھا ہوا قرآن کریم ہی، وہ نسخۂ امام تھا، جو ہر وقت آپکے پاس موجود رہتا تھا، اور جس کی طرف اشارہ کر کے حضورؐ ارشاد فرمایا کرتے تھے :- وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ ۶/۱۹

= اور میری طرف  یہ  قرآن وحی کیا گیا ہے۔

غور فرمائیگا! کہ ہٰذا اسم اشارہ قریب ہے جو موجود شے کیلئے آتا ہے۔ اگر قرآن کریم کتابی شکل میں موجود نہ ہوتا تو ہٰذا القرآن کے الفاظ کبھی نہ آتے۔ کیونکہ جب آپ یہ فرمایا کرتے تھے کہ میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے۔ تو اگر قرآنِ کریم کا مکتوب نسخہ کتابی شکل میں آپکے پاس موجود نہیں تھا تو مخاطب کہہ سکتے تھے کہ بتائیگا وہ کونسا قرآن ہے جو آپ پر نازل ہوا ہے۔ تو اُس وقت آپکا یہ جواب انتہائی مضحکہ خیز ہوتا، اگر آپ ہڈیوں پتّوں کے ٹوکرے کی طرف اشارہ فرماتے کہ

میری طرف  وحی کیا گیا ہے۔

۳۳/۷ ۔ قرآنِ کریم کے متعدد نسخے اِس نسخۂ امام سے روزانہ آپ کی نگرانی میں نقل ہوا کرتے تھے قرآن کریم کی روزانہ کتابت کے متعلق خداوند تعالیٰ نے خود مخالفینِ رسولؐ کی شہادت پیش کی ہے :-
وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ○ ۲۵/۵ (مفہوم) اور مخالفینِ رسولؐ کہتے ہیں کہ یہ قرآن پُرانے لوگوں کی کہانیاں ہیں جنہیں محمدؐ نے دل سے گھڑ کر خود لکھ لیا ہے۔ اور پھر یہ اسکی نگرانی میں صبح شام (یعنی روزانہ بدستور) املا کرایا جاتا ہے۔

اِس آیت مجیدہ میں رسولِ اکرم کے متعلق مصدر اکتتاب کی خبر دی گئی ہے۔ عربی دان حضرات خوب جانتے ہیں، کہ اکتتاب کا معنی ہے اپنے دِل سے گھڑ کر اپنے ہاتھ سے لکھنا ـــ یہ ہے آنحضورؐ کے نسخۂ امام کے متعلق قرآنی شہادت

کرائے تو آپ اپنے دستِ مبارک سے لکھا کرتے تھے۔ اور اسکے بعد اُس نسخہ سے روزانہ آپ کی نگرانی میں املا کرائی جاتی تھی[۱]۔ املا کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک شخص بولتا جاتا تھا اور بہت سے لکھنے والے لکھتے جاتے تھے۔ نیز تملٰی علیہ کے الفاظ سے بالوضاحت ثابت ہے کہ یہ املا کا کام رسولِ اکرم صلعم کی نگرانی میں کیا جاتا تھا۔ یعنی املا کئے ہوئے نسخوں کی تحریر کو حضور صلعم خود ملاحظ فرما کر اُن کی تصحیح فرمایا کرتے تھے[۲]۔

المختصر! قرآن کریم کی اپنی شہادت کیمطابق وحی کی کتابت کا کام اِسطرح ہُوا کرتا تھا کہ جسقدر وحی نازل ہوتی اُسے رسولِ اکرم صلعم خود دستِ مبارک سے نسخۂ امام میں لکھا کرتے تھے۔ اور اسکے بعد اُس نسخۂ امام سے قرآن کریم کے متعدد نسخوں کی روزانہ املا جاری رہتی تھی۔ اِسطرح خود رسولِ اکرم صلعم کی زندگی ہی میں آنحضرت صلعم کے امام نسخے کے علاوہ متعدد مزید نسخے تیار ہو چکے تھے۔ جنہیں آنحضرت صلعم نے اپنی سلطنت کے جملہ مراکز کے علاوہ بیرونِ سلطنت بھی بہت سے نسخے بھیجکر "یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا" $\frac{۷}{۱۵۸}$ کے مقدس اعلان کی عملی تصدیق فرما کر ثابت کر دیا تھا کہ لوگو! مَیں پوری نوعِ انسانی کیطرف رسول ہو کر آیا ہوں۔

۳۳ $\frac{}{۸}$۔ آنحضرت صلعم خود بھی حافظِ قرآن تھے اور آپنے متعدد مزید حافظِ قرآن بنائے بھی تھے

رسولِ اکرم صلعم کے حافظے کی یہ کیفیت تھی کہ نزولِ وحی کے ساتھ ہی قرآن کریم آپ کو حفظ ہو جاتا تھا۔ جیسا کہ ارشادِ باری ہے:۔ سَنُقْرِئُکَ فَلَا تَنْسٰیٓ ۝ $\frac{۶}{۸۷}$ = یقیناً ہم ہی آپکو پڑھاتے ہیں پھر آپ ہرگز نہیں بھولتے۔ اِس آیت مجیدہ کی شہادت کے مطابق حضور صلعم خود بھی حافظِ قرآن تھے۔ اور مزید مومن حفّاظ کی خبر آیتِ ذیل میں دیگئی ہے:۔

بَلْ ھُوَ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ فِیْ صُدُوْرِ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ $\frac{۴۹}{۲۹}$

(مفہوم) یہ قرآن کریم جو واضح آیات مجیدہ پر مشتمل ہے، اُن مومنوں کے صدورِ مبارک میں موجود و محفوظ ہے جنہیں علم (قرآن کریم) دیا گیا ہے[۳]۔ پس آیاتِ بالا سے ثابت ہُوا کہ رسولِ اکرم صلعم نے قرآن کریم کو کتابی شکل میں محفوظ کر دیا تھا۔ اِسکے

---

[۱] اِسی املا کی شہادت سورۂ قلم میں موجود ہے:۔ نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ۝ $\frac{۱}{۶۸}$ = اے نبی! قلم اور قرآن کی شہادت ہے جسے کاتب سطر وار لکھتے ہیں [۲] روایات کا کہنا ہے کہ حضور سلامٌ علیہ اَن پڑھ یعنی معاذ اللہ معاذ اللہ جاہل تھے لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ حالانکہ $\frac{۹۶}{۳-۴}$ میں حضور ہی کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے اِقْرَاْ وَرَبُّکَ الْاَکْرَمُ ۝ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ۔ اے رسول! پڑھیئگا۔ حقیقت یہ ہے کہ آپکا رب اکرم وہ ہے جس نے (آپکو) قلم کیساتھ تعلیم دی ہے۔ اب ظاہر ہے قلم کیساتھ لکھنا ہی سکھایا جاتا ہے۔ قلم کیساتھ گھڑ دوڑ یا تیر اندازی نہیں سکھائی جاتی۔ [۳] زمانۂ رسالت کے سارے مومن اوّلین اُوتوا العلم تھے لیکن سب کے سب حافظِ قرآن نہیں تھے۔ اِنکے لئے بلا استثنیٰ جمع کا صیغہ آنا، صحابہ کرام میں حفّاظ کی اکثریت کی خبر دیتا ہے۔

خود بھی حافظ تھے، اور صحابہؓ کی اکثریت کو بھی حافظِ قرآن بنا دیا تھا۔

فلھذا ترجمہ و تفسیر زیرِ نظر میں اس قرآنی مسلّمہ کو بھی سامنے رکھا گیا ہے کہ قرآنِ کریم زمانۂ رسالت ہی میں موجودہ کتابی شکل میں محفوظ تھا۔ اسکا متن، اعراب، نقطے، وقفے اور ترتیب سب کچھ وہی ہے جو رسولِ اکرم کے دستِ مبارک کے لکھے ہوئے قرآنِ کریم کے نسخۂ امام کی تھی۔ اور جو خود رسولِ اکرمؐ اور کثیر صحابہؓ کے صدورِ پُر نور میں موجود تھا۔

۲۳/۹ ترتیب قرآن کریم

مروّجہ تفاسیر کا کہنا ہے کہ قرآنِ کریم کی موجودہ ترتیب حضرتِ عثمانؓ کی دی ہوئی ہے، لیکن قرآن کریم اس نظریئے کو بھی قبول نہیں کرتا۔ سابقہ صفحات میں آیاتِ قرآنی کی رُو سے ثابت کیا جا چکا ہے کہ قرآنِ کریم کو خود رسولِ اکرمؐ، اِسکے نزول کے ساتھ ساتھ ہی کتابی شکل میں لکھ لیا کرتے تھے، تو اسطرح حضرتِ عثمانؓ کے متعلق قرآنِ کریم کے جمع کرنے کا نظریہ ہی سرے سے غلط ہے۔ کیونکہ آنحضرتؐ نے قرآنِ کریم کو ایک سیکنڈ کیلئے بھی پراگندہ صورت میں نہیں چھوڑا تھا۔ تو اس طرح جب قرآنِ کریم منتشر اور پراگندہ تھا ہی نہیں تو حضرتِ عثمانؓ یا کسی اور صحابیؓ کے جمع کرنے کا تصوّر تک ختم ہو جاتا ہے۔

تو اب جبکہ ثابت ہو چکا کہ اِسے خود رسولِ اکرمؐ نے کتابی صورت دی تھی۔ تو اسکے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے۔ کہ آنحضرتؐ نے اِسے کس ترتیب کیساتھ لکھا تھا؟ اسکا جواب بھی نہایت آسان ہے کہ آپنے اِسے، بالکل اُسی ترتیب سے لکھا تھا۔ جس ترتیب کیساتھ خود آپکے صدرِ مبارک میں محفوظ تھا اور جس ترتیب سے آپنے صحابہؓ کے کثیر التعداد حفّاظ کو حفظ کروا رکھا تھا۔

یاد رہے کہ ترتیب کے بغیر کسی چھوٹی سی کتاب کو بھی حفظ نہیں کیا جا سکتا۔ چہ جائیکہ مروّجہ تفاسیر کا دیا ہوا یہ تصوّر قبول کر لیا جائے کہ قرآنِ کریم رسولِ اکرمؐ اور کثیر التعداد صحابہ کو حفظ بھی تھا، اور بے ترتیب بھی تھا۔ العجب ثم العجب!

۲۴/۱۰ حفظ و ترتیب کا چولی دامن کا ساتھ ہے

جس حالت میں یہ امر مسلّم ہے کہ ترتیب کے بغیر حفظ ممکن نہیں۔ اور یہ امر بھی مسلّم ہے کہ رسولِ اکرمؐ اور متعدد صحابہؓ حافظ بھی تھے۔ تو بالصراحت ثابت ہو چکا کہ قرآنِ کریم کی ترتیب اسکے اوّلین حافظ خود رسولِ اکرمؐ کے صدرِ مبارک میں بصورتِ حفظ موجود تھی۔ اسی ترتیب کو آپنے کتابی صورت میں بشکلِ مشہود لکھ کر محفوظ کیا۔ (حضور کے صدرِ مبارک میں قرآن کی ترتیب کس نے دی تھی۔ اسکا جواب عنوان ۳۲/۱۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔ قرآنِ کریم، آنحضورؐ کی لکھی ہوئی کتاب ہے جسمیں کوئی بڑے سے بڑا دشمن قرآن بھی زیر زبر تک میں تغیّر و تبدّل نہیں کر سکا۔ کیونکہ اِسکی حفاظت کا ذمّہ خود خدا تعالیٰ نے لے رکھا ہے:۔

● إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○ ۱۵/۹

تحفّظِ ناموسِ رسالت و صحابہ

روایات کا دیا ہوا یہ تصوّر کہ رسولِ مقبولؐ نے اپنی زندگی میں قرآنِ کریم کو مرتب نہیں فرمایا تھا، بلکہ اِسے آیت آیت کی صورت میں پراگندہ

حالت میں چھوڑ گئے تھے، ناموسِ رسالت کو بہت بڑی طرح داغدار کرتا ہے۔ کہ آپکو جو ضابطۂ حیات قیامت تک کی نوعِ انسانی کیلئے دیا گیا تھا، آپ اُس ضابطے کو اِس پراگندہ حالت میں چھوڑ گئے۔ کہ معاذاللہ! اُسے آپکے بعد صحابہ رضی اللہ عنہم کو مرتّب کرنا پڑا۔ اور اسکے بعد پھر اِس نظریہ کی بدولت ناموسِ صحابہؓ بھی محفوظ نہیں کیونکہ بقولِ روایات اُنہوں نے قرآنِ کریم کو اسطرح اُلٹ پلٹ کر رکھدیا کہ جو آیت سب سے پہلے نازل ہوئی تھی اُسے تیسویں پارہ میں رکھا اور جو سب سے آخر میں اُتری تھی، اُسے کتاب کے ابتدائی حصّے میں رکھا۔ یا پھر معاذ اللہ معاذ اللہ اعراب نہ نقطے یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم کے مرتّب کردہ نسخہ ہائے قرآن کریم کے الفاظ پر نہ صرف یہ کہ زیر یں زبریں نہیں تھیں بلکہ نقطے بھی نہیں تھے۔ دُوسری طرف بخاری شریف میں مذکور ہے کہ آنحضور سلامٌ علیہ کا ارشاد ہے کہ قرآن کریم سات ؕ ؕ حرفوں پر نازل ہوا ہے یعنی اسکی سات قسم کی زیریں زبریں نازل ہوئی تھیں۔ العیاذُ باللہ!

۳۳/۱۱ - قرآنِ کریم کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟

روایات کا کہنا ہے کہ سب سے پہلے سورہ علق کی ابتدائی آیات کریمات کا نزول ہوا تھا۔ چنانچہ بخاری شریف مطبوعہ قرآن محل کراچی جلد اوّل کی کتاب الوحی صفحہ ۱۵ پر حضرت حارث بن ہشام کی روائت درج ہے کہ اُنہوں نے رسولؐ اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم سے دریافت کیا کہ آپکے پاس وحی کسطرح آتی ہے۔ تو رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ کبھی میرے پاس گھنٹے کی آواز کیطرح آتی ہے اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے اور جب میں اُسے یاد کر لیتا ہُوں جو اُس نے کہا تو وہ حالت مجھ سے دُور ہوجاتی ہے ...... حضرت عائشہ نے بیان کیا کہ میں نے سخت سردی کے دنوں میں آپ پر وحی نازل ہوتے ہُوئے دیکھا۔ پھر جب وحی موقوف ہوجاتی تو آپ کی پیشانی سے پسینہ بہنے لگتا

آگے بڑھنے سے پہلے روائتِ بالا پر قرآنِ کریم کی روشنی میں غور فرمالیں:۔

عـلـہ ۲/۹۷ میں ارشاد ہوا ہے:۔ ● فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ = پس بلاشبہ (جبریل .... ایک مخصوص مَلک جو انبیاء سلامٌ علیہم پر صُحُفِ ربّانی پہنچانے کیلئے مقرّر کیا گیا تھا) قرآن کریم کو آپکے قلبِ اطہر پر نازل کرتا تھا لیکن گھنٹے کی آواز کانوں سے سُنی جاسکتی ہے قلب سے نہیں۔ فلہذا وحی الٰہی کے گھنٹے اور گھڑیال کی صورت میں نازل ہونے کا تصوّر قرآنِ کریم کے خلاف ہے۔

عـلـہ دُوسرے نمبر پر سورہ طٰہٰ میں ارشاد ہوا ہے:۔ ● مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ ۲۰/۲ = ہم نے آپ پر قرآن اسلئے نازل نہیں کیا کہ آپ تکلیف یا سختی میں پڑ جائیں، فلہذا آپکے لئے، نزولِ وحی کا موجبِ تکلیف اور سختی ہونا بھی قرآن کریم کے خلاف ہے۔

عـلـہ تیسرے نمبر پر خداتعالٰی نے ارشاد فرمایا ہے:۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰٓى ۸۷/۶ = بیشک ہم آپکو پڑھاتے ہیں پھر آپ بھولتے نہیں۔ اِس آیت مجیدہ کی رُو سے آنحضور، وحی نازل ہوتے ہی حافظ ہوجایا کرتے تھے۔ فلہذا آپ

کیلئے قرآن کریم کو حفظ کرنے کی تکلیف و مشقّت کے نظریہ کا بھی قرآن کریم حامل نہیں۔

ع۵ چوتھے نمبر پر وحی کے وقت زور سردی کے دنوں میں پسینہ آجانے کا تصوّر بھی ۲۰/۲ کے خلاف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے قرآن کریم کو اسلئے نازل نہیں کیا کہ آپ کیلئے موجبِ تکلیف ہو۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ زور سردیوں میں پسینہ معمولی مشقّت میں نہیں آتا۔ بلکہ انتہائی جانکاہ مشقّت کے بعد ہی آتا ہے۔ اب آگے بڑھئے :۔

حضرتِ عائشہؓ ہی کی روائت سے صفحہ نمبر ۷۸ پر منقول ہے کہ :۔ سب سے پہلی وحی جو رسول اللہ پر اترنی شروع ہوئی وہ اچھے خواب تھے، جو بحالتِ نیند آپ دیکھتے تھے۔ چنانچہ جب بھی آپ خواب دیکھتے تو صبح کی روشنی میں ظاہر ہو جاتا۔ پھر تنہائی سے آپکو محبّت ہونے لگی ع۱ اور غارِ حرا میں تنہا رہنے لگے ع۲ اور قبل اسکے کہ گھر والوں کے پاس آنے کا شوق ہو۔ وہاں تحنث کیا کرتے۔ اور تحنث سے مُراد ہے کئی راتیں عبادت کرنی۔ اور اسکے لئے توشہ لیتے۔ یہاں تک کہ جب وہ غارِ حرا میں تھے، حق آیا۔ چنانچہ اُن کے پاس فرشتہ آیا اور کہا پڑھ۔ آپنے فرمایا کہ میں نے کہا کہ مَیں پڑھا ہوا نہیں ہوں ع۳۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ مجھے فرشتے نے پکڑا۔ اور مجھے زور سے دبایا۔ یہانتک کہ مجھے تکلیف محسوس ہوئی۔ پھر مجھ کو چھوڑ دیا، اور کہا پڑھ۔ میں نے کہا پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ پھر دوسری بار مجھے پکڑا اور زور سے دبایا۔ یہانتک کہ میری طاقت جواب دینے لگی۔ پھر مجھے چھوڑا، اور کہا پڑھ۔ میں نے کہا میں پڑھا ہوا نہیں ہوں۔ آپ فرماتے ہیں پھر تیسری بار پکڑ کر مجھے زور سے دبایا۔ پھر چھوڑ دیا اور کہا پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے انسان کو لبستہ خون سے پیدا کیا پڑھ اور تیرا رب سب سے بزرگ ہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلم نے اسکو دہرایا۔ اِس حال میں کہ آپکا دل کانپ رہا تھا۔ چنانچہ حضرت خدیجہؓ بنت خویلد کے پاس آئے۔ اور فرمایا کہ مجھے کمبل اُڑھا دو۔ مجھے کمبل اُڑھا دو۔ تو لوگوں نے کمبل اُڑھا دیا۔ یہانتک کہ آپکا ڈر جاتا رہا حضرتِ خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کیا۔ کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے حضرتِ خدیجہؓ نے کہا کہ ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپکو کبھی بھی رسوا نہیں کریگا۔ آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ ناتوانوں کا بوجھ اپنے اُوپر لیتے ہیں۔ محتاجوں کیلئے کماتے ہیں۔ مہمان کی مہمان نوازی کرتے ہیں۔ اور حق کی راہ میں مصیبتیں اُٹھاتے ہیں۔ پھر حضرتِ خدیجہؓ آپ کو لیکر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبد العزّٰی کے پاس لے گئیں۔ جو حضرت خدیجہ کے چچا زاد بھائی تھے ..... الخ

ع۱-۲ اِس روائت سے غارِ حرا میں خلوت گزینی کا نظریہ حضورؐ کی طرف رہبانیّت پسندی کا انتساب کرتا ہے۔ جو آپ پر بہتان محض ہے۔ کیونکہ آنحضورؐ کی قبل نبوّت کی زندگی کے متعلق سُورہ نجم میں بتایا گیا ہے :۔ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۵۳/۲ = لوگو! آپ کا ساتھی نہ گمراہ ہُوا ہے نہ بہک گیا ہے۔ اِس آئت سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نوعِ انسانی کے دُکھ سُکھ کے ساتھی تھے۔ اور یہ ساتھ کنجِ تنہائی میں بیٹھنے کا نام نہیں۔ معاشرہ کے دُکھیا انسانوں کی خدمت کرنے کا نام ہے۔ آپ کی یہ تعریف تو روائت بالا کے الفاظ میں بھی موجود ہے کہ آپ کنجِ تنہائی میں رہبانیّت کے عامل نہیں تھے۔ بلکہ صلہ رحمی فرماتے تھے، ناتوانوں کے بوجھ اُٹھاتے تھے۔ محتاجوں کیلئے کماتے، اور مہمانوں کی مہمان نوازی فرماتے تھے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ اعمال کسی کنجِ تنہائی میں سرانجام نہیں دیئے جا سکتے، بلکہ معاشرہ میں ناتوانوں اور محتاجوں کی شبانہ روز خدمت کرنے سے انجام پذیر ہوتے ہیں۔

قرآن کریم قیامت تک کی پوری نوعِ انسانی کیلئے مکمل ہدایت نامہ ہے

● أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۶/۱۱۴ = اے رسول کہدیجئیگا! کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور حاکم تلاش کروں حالانکہ اس نے اپنا حکمنامہ تمہاری طرف ایک مفصّل کتاب کی صورت میں نازل کردیا ہے۔

● وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً وَبُشْرَىٰ لِلْمُسْلِمِينَ ○ ۱۶/۸۹ = لے رسول ہم نے آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی ہے جو ہر چیز کو کھول کھول کر بیان کرنیوالی ہے۔ اور فرمانبرداروں کیلئے ہدایت، رحمت، بشارت ہے۔

● أَوَلَمْ يَكْفِهِمْ أَنَّا أَنزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَرَحْمَةً وَذِكْرَىٰ لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ○ ۲۹/۵۱ = اور اے رسول! کیا لوگوں کیلئے یہ کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر اپنی کتاب نازل کردی ہے، جو اُن پر پڑھی جاتی ہے بیشک اس میں ماننے والوں کیلئے رحمت اور نصیحت موجود ہے۔

آیاتِ بالا میں صراحتاً بتادیا گیا ہے کہ قرآن کریم مکمل مفصّل، تبیان، ہدایت، رحمت، بشارت، نصیحت اور کافی ہونے کیساتھ ساتھ قیامت تک کے لوگوں کیلئے ضابطۂ حیات بھی ہے۔ جبتک آنحضور بنفسِ نفیس زندہ رہے، لوگوں کو صرف اس قرآن کیساتھ ہی اُنکے فرائضِ منصبی سے آگاہ کرتے رہے۔ اور آپکے بعد ہر اُس مبلغ پر اس قرآن ہی کیساتھ لوگوں کو اُنکے فرائض سے آگاہ کرنا فرض ٹھہرایا گیا ہے جس تک یہ پہنچا ہے۔ اب چونکہ اسکی حفاظت کو خود خدا تعالیٰ نے اپنے ذمّہ لے رکھا ہے:۔ إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ○ ۱۵/۹، اسلئے یہ امر ممکن ہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں قرآن کریم، مرورِ زمانہ کے ہاتھوں ضائع یا گم ہوجائے۔ پس ظاہر ہے کہ یہ قیامت تک کیلئے اسیطرح محفوظ رہیگا جسطرح چودہ سو سال سے آجتک محفوظ ہے کہ مخالف قومیں اسکی زیر زبر تک کو نہ ضائع کرسکی ہیں، اور نہ اُن میں کوئی معمولی سی تبدیلی ہی لاسکی ہیں۔

باقی انبیاء اپنی اپنی قوم کیطرف مبعوث کیے گئے تھے۔ لیکن صاحبِ قرآن کو پوری نوعِ انسانی کیطرف بھیجا گیا تھا

● لَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِ ۷/۵۹ بلاشبہ ہمنے نوح کو اُسکی قوم کیطرف (رسول بناکر) بھیجا۔

● وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۷/۷۳ اور قوم ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح کو بھیجا۔

● وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۷/۸۵ اور اہل مدین کیطرف اُن کے بھائی شعیب کو بھیجا۔

● ثُمَّ بَعَثْنَا مِن بَعْدِهِم مُّوسَىٰ بِآيَاتِنَا إِلَىٰ فِرْعَوْنَ وَمَلَئِهِ ۷/۱۰۳ = پھر اُن کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی آیتوں کیساتھ فرعون اور اُسکے سرداروں کی طرف مبعوث فرمایا۔

● وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُم ۶۱/۶ = اور وہ وقت قابلِ ذکر ہے، جب مریم کے بیٹے عیسیٰ نے بنی اسرائیل کو کہا کہ میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوکر آیا ہوں۔

آیاتِ بالا میں متعدد انبیاء سلام علیہم کے اسماءِ گرامی بیان کرکے واضح کیا گیا ہے کہ وہ اپنی اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے تھے۔

لیکن آنحضورؐ کے متعلق خود ارشادِ باری ہے :-

● قُلْ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ جَمِیْعًا ۱۵۸/۷ = اے رسولؐ! کہہ، یقیناً کہ اے نوعِ انسانی! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

اس آیتِ مجیدہ سے بالصراحت ثابت ہے کہ آنحضور سلام علیہ پوری نوعِ انسانی کے رسولؐ تھے۔ تو اسطرح جو کتاب آپکو دی گئی تھی یعنی جس کتاب کے آپ رسولؐ تھے۔ اور جس کتاب کا بلاغ آپکا فریضۂ رسالت تھا، وہ کتاب خود پوری نوعِ انسانی کیلئے خدا تعالیٰ کا نازل کردہ ہدایت نامہ اور مکمل ضابطۂ حیات ہے۔

آنحضورؐ خاتم النبیین تھے۔ آپکے بعد اور کوئی نبی نہیں آئیگا۔ نہ نیا نہ پرانا

اب چونکہ قرآن کریم قیامت تک کی نوعِ انسانی کیلئے مکمل ضابطۂ حیات اور کامل واکمل ہدایت نامہ ہے۔ نیز چونکہ رسولؐ مقبول قیامت تک کی نوعِ انسانی کیلئے رسولؐ تھے، اسلئے خدا تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت اپنے ذمہ لیکر ۹/۱۵، آئندہ کیلئے نبیوں کا سلسلہ بند کر دیا ہے :-

● مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ۴۰/۳۳ = محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں۔ اور لیکن (وہ اس جہت سے پوری امت کے دینی باپ ہیں کہ) وہ اللہ کے رسولؐ اور نبیوں کو ختم کرنیوالے ہیں — اس آیتِ مجیدہ کی رو سے ثابت ہے کہ آپکے بعد آپ کی کتاب کو قیامت تک کیلئے محفوظ کر کے نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے۔ پس اب کوئی بھی نبی نہیں آئیگا۔ نیا اسلئے نہیں کہ ضابطۂ خداوندی میں اس سلسلہ کو بند کر دیا گیا ہے۔ اور پرانا اسلئے نہیں، کہ پرانے نبیوں میں سے نہ کوئی زندہ ہے نہ آئیگا۔ سب وفات پا چکے ہیں :-

● وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۱۴۴/۳ = نہیں ہیں محمدؐ مگر آپ ایک رسولؐ ہیں۔ آپ سے پہلے سب رسولؐ گزر چکے ہیں۔

● مَا الْمَسِیْحُ ابْنُ مَرْیَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۷۵/۵ — نہیں ہیں مریم کے بیٹے مسیحؑ مگر ایک رسولؐ آپ سے پہلے سب رسولؐ گزر چکے ہیں۔

ان آیات کریمات کے تقابل سے ثابت ہوتا ہے کہ جسطرح مسیح سلام علیہ سے پہلے جملہ رسولوں کے متعلق کہا گیا ہے۔ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ = اسی طرح آنحضور سلام علیہ کے متعلق ارشاد ہوا قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ — تو اب جس طرح قَدْ خَلَتْ کی خداوندی خبر کے مطابق حضرتِ مسیحؑ سے پہلے رسولوں میں سے کوئی زندہ نہیں، اسیطرح آنحضورؐ سے پہلے رسولوں میں سے بھی بشمولِ مسیح سلام علیہ نہ کوئی زندہ ہے اور نہ کوئی آئیگا۔ حضرتِ مسیحؑ کے متعلق روایات کی یہ خبر کہ آپ دوسرے یا چوتھے آسمان پر زندہ ہیں اور نازل ہونگے، آیاتِ بالا کے خلاف ہے۔

۳۳/۱۲ - آنحضورؐ ہدایت کے متلاشی تھے قرآن کریم معاشرہ کے دکھوں کا مداوا ہے

سورۃ وَالضُّحٰی میں ارشاد ہوا ہے :-

● وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى ۹۳/۸ = اور اللہ تعالیٰ نے آپکو تلاش ہدایت میں سرگرداں پایا، پس آپ کی ہدایت فرمائی — اِس آیت کی تفسیر کیلئے زمانۂ رسالت سے ماقبل زمانۂ جہالت کو نگاہوں کے سامنے لائیے۔ جب ہر طرف ظلم و استبداد کے اندھیروں نے پُوری کائنات کو گھپ تاریک کر رکھا تھا جب زبردست انسان بالادستوں کے ظلم و ستم کی چکّی میں شبانہ روز پس رہے تھے اور کوئی دِل اُن کی بے پناہ مظلومیّت کیلئے پسیجتا نہ تھا۔ بے گناہ چھوٹی بچّیوں کو گڑھا کھود کر زندہ دبا دیا جاتا۔ لیکن کوئی آنکھ اُن ناکردہ گناہ مظلوموں کیلئے ایک آنسو تک نہیں بہاتی تھی۔ نہ سفر محفوظ تھے نہ حضر مامون۔ نہ عزّت محفوظ تھی نہ عصمت مصئون۔ پُوری دُنیا کی زیردست انسانیّت بالادستوں کی زرخرید ملکیت بنی ہُوئی تھی۔ نوعِ انسانی کی خرید فروخت کیلئے سرِ بازار منڈیاں لگائی جاتی تھیں۔ اور اِس افضل ترین نوع کے مرد و عورتیں، بھیڑ بکری کیطرح دِن دہاڑے بکا کرتے تھے۔ ہر خریدار منڈی کی اِس جنس مرد و عورت کو خریدنے سے پہلے اِسطرح کھینچ داب اور مسل دھسل کر پرکھتا ہُوا پایا جاتا، جسطرح بھیڑ بکری کے ایک ایک عضو کے متعلق تسلّی کیجاتی ہے — عورت کا معاشرہ میں کوئی مقام ہی نہ تھا، متوفّیؔ کے مالِ متروکہ کی طرح عورت کو بھی وراثت کا مال ہی سمجھا جاتا تھا۔ جنسی بے راہ روی کی یہ حالت کہ لونڈیاں آپس میں چند دِنوں کے لئے عاریتاً بھی دی جایا کرتی تھیں۔

● اِس انتہائی ظلم و ظلمت کے زمانے میں ایک فردِ محترم پیدا ہُوئے جن کا خاندانی نام رکھا گیا تھا احمدؐ ۶/۶۱۔
لیکن یہ احمدؐ (اللہ کی بے حد تعریف کرنیوالا) اِس بے پناہ ظلم و تاریکی کے زمانے میں گوناگوں خوبیوں، صداقتوں اور راستبازیوں کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں محمدؐ ہوگیا (حمد در حمد کیا ہُوا) ہر چہار طرف سے اِس مردِ کامل کی تعریفوں کے پُل بندھ گئے اور حالت یہ ہوگئی کہ آپکو، اُس بدترین معاشرہ میں بے اختیار محمدؐ کے پیارے نام سے پُکارا جانے لگا۔ (تعریفوں میں ڈوبا ہُوا) حالت یہ تھی کہ معاشرہ کے ہر گوشے میں آپ کی تعریفیں ہو رہی ہیں۔ ہر مقام پر آپ کی عزّت کی جاتی ہے۔ ہر مُعاملے میں آپ کو حاکم و منصف مانا جاتا ہے۔ صادق و امین کے بہترین القاب آپکے لئے مختص کر دیئے گئے ہیں۔ لیکن آپ خوش نہیں تھے یعنی آپ اِن گوناگوں سعادتوں کے باوجود غمگین رہتے تھے۔

کیوں؟ ←—— اِس لئے کہ آپ صرف اپنے لئے عزّت و وقار کے متمنّی نہیں تھے۔ بلکہ پُوری نوعِ انسانی کو بالکل مساوی انداز میں باعزّت و باوقار دیکھنا چاہتے تھے۔ آپ دُکھی انسانیت کے مداوا کے طلبگار تھے۔ آپ نوعِ انسانی کے اُن افراد کو، جو منڈی کی جنس بن کر سرِ بازار بکا کرتے تھے، اُنکا اصلی مقام دلانا چاہتے تھے۔ صنفِ نازک کے کھوئے ہُوئے وقار کی واپسی کے متمنّی تھے۔ زندہ دبائی جانیوالی لڑکیوں کو جینے کا حق دلانے کیلئے مغموم و مضطرب رہتے تھے۔ مزدُور کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر سے سرمایہ دار کا غاصبانہ حق زائل کر کے مزدُور اور اُسکے بےگناہ بچّوں کے لبوں کو بھی تبسّم آشنا دیکھنے کے طلبگار تھے۔ اعلیٰ و ادنیٰ، عربی و عجمی، قریشی و غیر قریشی، ہاشمی و اموی، کالا گورا، اسود و احمر، مزدُور و سرمایہ دار، مالک و مزارع، آقا و غلام اور بندہ و صاحب سب کے جملہ انسانیت سوز امتیازات کو یک قلم موقوف کر کے، پُوری

کی پوری نوعِ انسانی کے ایک ایک فرد کو صرف اور صرف نوعِ انسانی کے ہموار اور فرحت افزا مقام پر فائز دیکھنا چاہتے تھے، جہاں ہر طرف مسرتیں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیں۔ اور پورے معاشرے کے ایک ایک فرد کی لبوں پر، ہر آن ایک جیسی مسکراہٹیں کھیلتی ہوئی پائی جائیں۔

● آپؐ کو ان حسین تمناؤں اور جنتّ بدوش حسرتوں کی تکمیل کیلئے ایک لازوال رہنمائی کی ضرورت تھی۔ اسی ہدایت کیلئے آپ حیران و سرگردان تھے کہ ایک ایسی تحریک کا آغاز کیا جائے جس کا انجام مذکورہ بالا تمناؤں کی فردوس مشہود ہو۔ آپ اپنے گرد و پیش کے انسانوں کو ایک منشور بطور بنیاد دینا چاہتے تھے، جس پر دکھیا انسانیت کے مداوا کی عمارت اٹھائی جائے۔ چنانچہ رحمتِ باری جوش میں آئی اور آپ پر نزولِ وحی کی ابتدا ہوئی۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ ۲/۱۸۵۔ رات کا وقت مکمل تنہائی اور سکوت ۱۷/۱، بستی سے باہر مسجد اور باغ ۱۷/۱ + ۵۳/۱۵۔ بہار کا موسم ۵۳/۱۹، جب ہر طرف نئی جوانی کا آغاز ہوتا ہے، مُردہ دلوں میں بھی نئی زندگی کی لہریں دوڑتی ہیں۔ ایسے پُر فضا مقام اور سہانے وقت میں، اُس طلبگارِ ہدایت کو، جو مذکورہ بالا فردوس نگاہ و گوش تمناؤں اور حسرتوں کی تکمیل کیلئے ایک عظیم الشان مہم کی ابتدا کرنا چاہتا تھا، باری تعالیٰ نے خود اُسی کے اندازِ تکلّم میں یعنی اُسی کو متکلّم بنا کر ارشاد فرمایا (اے غمخوارِ انسانیت!) اللہ صاحب بخششِ عامہ اور رحمت خاصہ کے نام کیساتھ اقرار و اعلان فرمایئے۔ الحمدُ لِلّٰہِ پوری کی پوری حمد و ستائش اللہ تعالیٰ کیلئے ہے۔ جو جملہ جہانوں کی جملہ مخلوق کا ربّ روزی رساں سب کیلئے یکساں طور پر سامانِ ربوبیّت مہیّا کرنیوالا ہے۔ حقوقِ ربوبیّت کے لحاظ سے اُسکے ہاں نوعِ انسانی کے ایک ایک فردِ کا حقّ ربوبیّت مسلّم ہے۔ وہ ربّ العٰلمین ہے۔ صرف ربّ المترفین یا ربّ المسلمین نہیں وہ سب کا رب ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ۱/۱

● رسولِ اکرمؐ قبلِ نبوت کے پُر اضطراب دور میں جب دکھی انسانیتّ کے مداوا کی تلاش میں طلبگارِ ہدایت تھے، اسوقت آپ یہ نہیں جانتے تھے کہ مجھ پر کتاب اُترنے والی ہے۔ وَمَا كُنْتَ تَرْجُوْٓا اَنْ يُّلْقٰٓى اِلَيْكَ الْكِتٰبُ اِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۲۸/۸۶۔ چنانچہ عالمین کے پروردگار نے طلبگارِ ہدایت ہی کو متکلّم بنا کر آپ ہی کی زبانِ فیض ترجمان سے گوہر افشانی فرماتے ہوئے کتابِ مجید کی افتتاحی سُورت مجیدہ نازل فرمائی۔ جو آنحضرتؐ کی حسین آرزوں اور مسرّت بدوش حسرتوں کا آئینہ بھی ہے ۹۳/۴۔ قرآن کریم کی فہرست بھی ہے۔ پورے قرآن میں دہرائے ہوئے سات عنوانات پر مشتمل بھی ہے ۱۵/۸۷۔ اور اس مبارک تحریک کا سات نکاتی منشور بھی ہے، جس تحریک کا افتتاح آپنے نوعِ انسانی کو اُسکی گوناگوں مصائب و مشکلات سے نجات دلانے کیلئے، قرآن کریم کے نزولِ اوّل کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ کی طرف سے ابتدائی ہدایات اور نوعِ انسانی کے نام احکامات اور قوم کے سوالوں کے ضروری جوابات مِل چکنے کے فوراً بعد فرمایا۔ اور سورہ فاتحہ ہی کے سات عنوانات، اور اپنے سات نکاتی منشو کے اعلان ہی میں، قوم پر واضح کر دیا کہ آپ کیا لیکر آئے ہیں۔ کس بحرِ عمیق کے شناور اور کس میدان کے شاہسوار ہیں۔ آپکی مقدّس تحریک کی ابتدا کیا ہے اور انتہا کیا ہو گی۔

المختصر! سورہ فاتحہ پورے قرآن کریم کا نچوڑ، پورے قرآن کا اجمال ہے۔ پورا قرآن اس اجمال کی تفصیل ہے۔ سورہ بقرکی ابتدائی بیس آئتوں میں آنحضور کو ہدایات دیگئی ہیں کہ آپکی پاکیزہ مہم اور مبارک تحریک کے سلسلے میں آپکو تین قسم کے لوگوں کیساتھ واسطہ پڑیگا۔ ۱- مومن　۲- کافر　۳- منافق

مومن وہ ہونگے، جو آپ پر، قرآن کریم پر، سابقہ کتابوں اور آخرت پر ایمان لائینگے۔ نظام ربوبیّت کے قیام میں آپکا ساتھ دینگے۔ اور اسکے لئے اپنے مال خرچ کرینگے $\frac{2}{3-4}$

کافر وہ ہونگے جو آپکی نبوّت کا، قرآن کریم اور آخرت کا مطلقاً انکار کردینگے۔ انہیں سمجھانا، یا نہ سمجھانا برابر ہوگا۔ انکے ذہنوں اور کانوں پر نہ سننے اور نہ سمجھنے کی مُہر ہوگی۔ اور انکی آنکھوں پر باپ دادا کی تقلید کے پردے پڑے ہوئے ہونگے $\frac{2}{6}$ وہ ایمان لانیوالے نہیں ہونگے۔ آپکے ساتھ مغزاری نہ فرمائیگا۔

منافق وہ ہونگے، جو زبان سے ایمان کا اقرار کرینگے لیکن دراصل مومن نہیں ہونگے۔ وہ درپردہ کافروں کیساتھ ملے ہوئے ہونگے۔ آپکے پاس آئینگے تو ایمان کا اظہار کرینگے۔ اور جب اپنے خلوت نشین پیشواؤں کے پاس جائینگے تو ان سے کہینگے کہ ہم آپکے ساتھ ہیں۔ مومنوں سے تو ہم محض مذاق کرنے جاتے ہیں $\frac{2}{8-14}$ ——— یعنی ایسے لوگوں کے متعلق آنحضور کو ہدایت دیگئی ہے کہ ایسے لوگ انتہائی خطرناک ہونگے۔ ان سے پوری طرح بچ کر رہنا ہوگا۔

اس طرح پہلی بیس آئتوں میں مذکورہ بالا تینوں قسم کے لوگوں کے متعلق مختصر ہدایات دے چکنے کے بعد آئت نمبر ۲۱-۲۲ میں پوری نوع انسانی کی طرف قرآن کریم کا پہلا خطاب ہے:-

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعْبُدُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُمْ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ○

ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ فِرَٰشًا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهِۦ

مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ فَلَا تَجْعَلُوا۟ لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ○ $\frac{2}{21-22}$

(مفہوم) اے پوری نوع انسانی! اپنے پروردگار کی عبودیّت (فرمانبرداری) کرو، جو تمہارا بھی رب ہے، اور ان لوگوں کا بھی رب ہے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ (یہ خالصًا رب تعالیٰ کی فرمانبرداری کا حکم اسلئے دیا گیا ہے) تاکہ تم زندگی کی جملہ مشکلات اور معاشرہ کے ہر قسم کے خطرات و مصائب سے بچ جاؤ۔ تمہارا رب وہ ہے جس نے تم سب کے سب کیلئے زمین کو فرش اور آسمان کو بناءِ (ربوبیّت) بنایا ہے۔ یعنی وہ بلندی سے پانی نازل کرتا ہے۔ پھر اس پانی کیساتھ تم سب کے سب کیلئے ہر قسم کے میوہ جات پیدا کرتا ہے پس تم اللہ کیلئے (اسکی ربوبیّت میں) غیراللہ کو شریک نہ ٹھہراؤ۔ کیونکہ (کائنات اور اسباب ربوبیّت میں غیراللہ کی عدم

شرکت اس طرح نمایاں ہے کہ اِس حقیقت کو تم سب جانتے ہو۔
اِس کے بعد آئت نمبر ۲۳ تا ۲۸، معترضہ جملے ہیں۔ اور آئت نمبر ۲۹ میں ربوبیّتِ عالمینی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۱ کا تائیدی اور تاکیدی اعلان ہے:۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۲/۲۹

(مفہوم) اے نوعِ اِنسانی! اللہ ہی وُہ عظیم الشّان ذات ہے۔ جس نے جو کچھ بھی زمین میں پیدا کیا ہے، وُہ سب کا سب تم سب کے سب کے لئے پیدا کیا ہے۔

بالفاظِ دیگر:۔
قرآنِ کریم ناہموار تقسیمِ رزق کے جملہ نظاموں کے خلاف، ہموار و متوازن تقسیمِ رزق کا نظام پیش کرتا ہے۔ اور اِسی نقطۂ ماسکہ کے گرد اِس کی پُوری تعلیم گردش کرتی ہے۔

حاصل کلام | برادرانِ اِسلام!

یہ ہے زیرِ نظر ترجمہ و تفسیر کا تعارف، جو خود قرآنِ کریم کے آئینے میں، اِس طرح عام فہم انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ مشکل الفاظ اور قواعد و گرامر کی مشکل اصطلاحوں سے عمداً پرہیز کر کے آسان اصطلاحیں پیش کیگئی ہیں، تاکہ کم علم اصحاب بھی سمجھ سکیں۔ اِس پُورے مضمون کا خلاصہ یہ ہے:۔

● قرآنِ کریم کا یہ ترجمہ اور تفسیر قرآن فہمی کے اُن اصولوں پر مبنی ہے، جو خُود قرآنِ کریم نے پیش کئے ہیں۔
● پُوری تفسیر کا محوری نقطہ، قرآنِ کریم کے ابتدائی اور انتہائی اعلان، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ۱/۱

اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۱۱۴/۱ کے مطابق ربوبیّتِ عالمینی ہے۔
یاد رہے کہ خُود قرآنی تعلیم کی روشنی میں:۔
قرآنِ کریم کی غرض نزول یہ ہے:۔

قرآنِ کریم کی غرضِ نزول یہ ہے

کہ پُورے کُرّہ ارض پر پوری نوعِ انسانی کا ایک عالمگیر ہموار و متوازن نظامِ ربوبیّتِ عامہ قائم ہو۔ نسلی، لسانی، جغرافیائی، امیر و غریب، مالک و ملازم، زمیندار و مزارع، کارخانہ دار و مزدور، کے جملہ امتیازات ختم ہو جائیں اور پوری زمین اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی عملی تفسیر بن جائے۔ جس میں :-

- نہ کوئی بھوکا ہو نہ ننگا۔
- نہ بے مکان ہو نہ بے علاج۔
- نہ کوئی ساہوکار ہو نہ قرضدار۔
- نہ کوئی کرایہ خواہ ہو نہ کرایہ دار۔

ہر فردِ انسانی، ضروریاتِ زندگی سے سوفیصدی بہرہ یاب ہو۔ پورا کُرّہ ارض ایک گھر بن جائے، اور پوری نوعِ انسانی ایک کنبہ

- نہ کہیں توپیں اور ٹینک آگ اُگلتے ہُوئے پائے جائیں۔
- نہ کہیں نیپام بموں کا خوف ہو، نہ ہائیڈروجن اور ایٹم بموں کا خطرہ۔

پس زیرِ نظر ترجمہ و تفسیر کے اِس تعارف، اور قرآنِ حکیم کے محوری نقطہ ربوبیّتِ عامہ کو نگاہ میں رکھئے اور اب اللہ کا نام لیکر، سورہ فاتحہ کا ترجمہ و تفسیر ملاحظہ فرمایئے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ ۲/۲۸۶

رَبِّ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ هَمَزٰتِ الشَّيٰطِيْنِ ○

وَاَعُوْذُ بِكَ رَبِّ اَنْ يَّحْضُرُوْنِ ○ ۲۳/۹۷-۹۸

قرآنِ کریم کے مفسّر نہیں خادم

قرآنِ کریم کی تفسیر بذریعہ آیات کریمات خود قرآنِ کریم کے اندر موجود ہے۔ اور اس کا مفسّر خود اللہ تعالیٰ ہے۔ ہم مفسّرینِ قرآن نہیں بلکہ خادمینِ قرآن بتصریفِ آیات الفرقان ہیں:۔

ادارہ بلاغ القرآن ۱۱۰۔ این سمن آباد لاھور (پاکستان)